مختصر مقدمہ ہے، اس کی ترتیب و اشاعت پر لائق مرتب تاریخ ہند کے طلبہ کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

فہرست مخطوطات عربی جلد دوم } مرتبہ مولانا امتیاز علی عرشی، متوسط تقطیع، کاغذ،
فہرست مخطوطات اردو جلد اول } کتابت و طباعت عمدہ صفحات بالترتیب ۴۸۹ و ۴۴۴ مجلد، قیمت [illegible] و ۲۵ روپے، ناشر رضا لائبریری ٹرسٹ رام پور، یوپی

یہ رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی دوسری اور اردو مخطوطات کی فہرست کی پہلی جلد ہے، جو حکومت ہند کی وزارت تعلیمات کی امداد سے شائع کی گئی ہیں، عربی فہرست میں اذکار و ادعیہ، کلام و عقائد اور رد و مناظرہ کی تقریباً گیارہ سو اور اردو فہرست میں مذہب، معقولات اور تاریخ و تذکرہ کی دو سو سے زیادہ قلمی کتابوں کا ذکر ہے، عربی مخطوطات کی فہرست انگریزی میں مختصر دی گئی ہے، اس میں تصنیف و مصنف کے نام، سنین وفات، مخطوط کے زمانہ، شان خط، سائز، صفحات، سطروں کی تعداد اور مکمل و ناقص ہونے کی تصریح کی گئی ہے، اردو فہرست مفصل ہے، اس میں تصنیف و مصنف کا کسی قدر تفصیلی تعارف اور ان کے متعلق ضروری اور مفید معلومات دیئے گئے ہیں، آخر میں مصنفین اور کتابوں کے ناموں کے اعتبار سے دو فہرستیں ہیں، فنون کے اعتبار سے کوئی فہرست نہیں ہے، مقدمہ میں لائبریری کے گذشتہ حالات کا ذکر ہے، دونوں فہرستوں میں فن وار کتابوں کا تذکرہ ہے، مزید سہولت کے لیے ہر فن میں شیعہ، سنی اور دوسرے فرقوں کی کتابوں کا علحدہ علحدہ ذکر ہے، ترتیب و تدوین کی خوبی کے لیے مرتب کا نام پوری ضمانت ہے، ان کی اشاعت سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

"ض"

جلد ۱۰۷، ماہ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۱ء، عدد ۳

مضامین

شذرات

دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی اور سربلندی حاصل کرنے کی دو ہی طاقتیں ہیں، ایمانی قوت اور مادی وسائل، بلکہ اصل قوت ایمانی ہے، وہی دنیاوی وسائل بھی پیدا کرتی ہے، ایمان اور ایمانی قوت ایک مذہبی اصطلاح ہے، مگر اس کے اصلی معنی ہیں کسی حقیقت و صداقت اور کسی مقصد و نصب العین پر یقین واثق اور اس کے حصول کے لیے ایثار و قربانی کا ایسا جذبہ کہ اگر اس کی راہ میں جان دینے کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی بلا تامل نثار کر دیا جائے، یہ مقصد دینی بھی ہوتا ہے اور دنیاوی بھی، ان میں سے جس کے لیے بھی قربانی کی جائیگی وہ ضرور حاصل ہوگا، مگر ان دونوں میں نتائج کے اعتبار سے بڑا فرق ہے، مادی نصب العین کے فوائد اسی دنیا تک محدود ہوتے ہیں اور وہ اخلاقی قوانین کا پابند نہیں ہوتا، اس لیے مادی فوائد کے ساتھ اس کے نقصانات اور مضرتیں بھی کم نہیں، جس پر مغربی قوموں کی مادی ترقی کے نتائج شاہد ہیں، جو نہ صرف دنیا کیلیے ہلاکت و بربادی کا سامان بن گئے ہیں بلکہ خود ان قوموں کو اخلاقی اور روحانی حیثیت سے اتنا تہی دامن کر دیا ہے کہ انکی تہذیب خطرہ میں پڑ گئی ہے اور ان کے بڑے بڑے مفکرین اس کے خلاف آواز بلند کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، اس کے مقابلہ میں دینی و اخلاقی نصب العین کے فوائد دنیا و آخرت دونوں پر حاوی ہیں، اور وہ ہر قدم پر اخلاقی قوانین کا پابند ہوتا ہے اس لیے عالم انسانیت کے لیے سراسر رحمت ہے۔

مسلمانوں کو غور کرنا چاہیے کہ ان دونوں طاقتوں میں سے انکو کونسی طاقت حاصل ہے جس کے ذریعہ وہ آخرت میں نہ سہی دنیا ہی میں عزت و وقار کے مستحق بن سکیں، بیشک وہ گنتی کے لیے مسلمان ہیں اور ایک ارب ہیں بھی لیکن ان میں وہ قوت ایمانی کہاں ہے جس نے ان کو خدا کے سوا ساری دنیا سے بے خوف

بنا دیا تھا، وہ بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان میں وہ سارے اوصاف پیدا کر دیے تھے جس کا لازمی نتیجہ دین و دنیا دونوں میں سربلندی ہے، وہ دین و ملت کے لیے اپنا سارا خانماں لٹا دیتے تھے، ان کے نوجوان خود بڑھکر اپنے کو جہاد کے لیے پیش کرتے تھے، بوڑھی مائیں اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو بلا تکلف میدان جنگ میں بھیجدیتی تھیں اور انکی شہادت پر خوش ہوتی تھیں کہ ان کا بیٹا اور شوہر دین و ملت کی راہ میں کام آیا، ان میں ایسی وحدت و اخوت تھی کہ پوری ملت اسلامیہ ایک جسم بن گئی تھی، اگر ایک مسلمان کو کوئی تکلیف ہوتی تھی تو دوسرا مسلمان اسکا درد محسوس کرتا تھا، انصار نے مہاجرین میں سگے بھائیوں کی طرح اپنی املاک تقسیم کر دی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فتح و کامرانی ان کے قدم چومتی تھی، انھوں نے جس طرف بھی رخ کر دیا بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ الٹ دیا اور ایک صدی کے اندر ایسی عظیم الشان حکومت قائم کر دی جس کا ایک سرا سندھ سے ملتا تھا اور دوسرا چین اور فرانس سے، انھوں نے محض کشور کشائی نہیں کی بلکہ اسی کے ساتھ ساری دنیا کو خدا شناسی، اخلاق و روحانیت، علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کا سبق پڑھایا اور اسمیں وہ اقوام عالم کے معلم و امام بن گئے اور ان کی روشنی سے ساری دنیا کو منور کیا اور ان ہی کی ڈالی ہوئی بنیاد پر موجودہ علوم کا عظیم الشان قصر تعمیر ہوا۔

اس کے مقابلہ میں آج کے مسلمانوں کا قومی مزاج ہی بگڑ گیا ہے، وہ نہ صرف ایمانی قوت بلکہ دنیا میں سربلندی کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے ان سے بھی محروم ہیں، دین و ملت کے لیے جانی و مالی قربانی تو بڑی چیز ہے، ادنی زحمت و تکلیف بھی گوارا نہیں کر سکتے، لغو و بے نتیجہ بلکہ مضر و مہلک تفریحی مشاغل پر بے حساب روپیہ برباد کرتے ہیں اس کا عشر عشیر بھی قوم و ملت کی راہ میں صرف نہیں کر سکتے جس سے ملت اسلامیہ کی تمام

ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، ان میں وحدت و تنظیم کے بجائے اختلاف اور جماعت بندی کا ہے، دینی و ملی
کے مشترک مسائل میں بھی اتحاد نہیں، ہر جماعت کو اپنی قیادت کی فکر ہے، اشخاص اس سے مستثنیٰ کئے جا
ئیں گے لیکن قومیں چند افراد سے نہیں بلکہ ان کی اکثریت سے بنتی ہیں۔

قریب قریب پوری دنیائے اسلام کا یہی حال ہے، باہمی اختلاف کی وجہ سے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، عرب جو اسلام کے سب سے بڑے حامل تھے، ان کا حال سب سے برا ہے، جن ملکوں میں دولت آگئی ہے، وہ مغربی تہذیب اور عیش و تنعم میں غرق ہیں، ان کی زبانوں پر اسلامی وحدت و اخوت کے بجائے قومیت و وطنیت اور سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے ہیں، ان کے اختلافات نے ان کی قوت پارہ پارہ کر دی ہے، اور وہ مغربی قوموں کے سہارے زندہ ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند لاکھ یہودیوں نے کروروں عربوں کو انکی سرزمین سے محروم کر دیا ہے، اور وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، پاکستان اسلامی نظریہ پر قائم ہوا تھا، اسلام کا سوال الگ رہا، آج وہاں ملکی و وطنی وحدت کا بھی فقدان ہے، اور اس کے ہر حصہ میں صوبائی، نسلی اور لسانی اختلاف برپا ہے جس سے پاکستان کا وجود ہی خطرہ میں پڑ گیا ہے، ہندوستان کے مہاجرین جن کی قربانیوں سے پاکستان قائم ہوا تھا، اجنبی سمجھے جاتے ہیں، خصوصاً مشرقی پاکستان میں تو اُن کے ساتھ معاندانہ سلوک ہے، ان حالات میں اگر مسلمان نکبت و ادبار میں مبتلا ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے، یہ تو ان کے اعمال اور قانونِ قدرت کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کو ہدایت دے اور انکے حال پر رحم فرمائے۔

مقالات

مُستَدرکِ حاکم اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

از مولوی ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین

(۴)

آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:-

"حاکم کے اندر تشیع کیجانب میلان کا جو ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب اقتضاء سے بڑھکر بھی رہا ہو جب بھی یہ اس حد و انتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخینؓ کی مذمت و تنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علیؓ کو ان سے بڑھکر مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو بھی بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کو فوقیت دیتے رہے ہوں، کیونکہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت و تفضیل پر گذرا ہے، اس میں انھوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، اسی طرح مستدرک میں انھوں نے حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمانؓ کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ

اول حجر حمله النبی صلی اللہ علیہ	مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر خود آنحضور
وآلہ وسلم لبناء المسجد ثم حمل	صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا، پھر دوسرا حضرت ابوبکرؓ نے
ابوبکر حجرا آخر ثم حمل عمر ثم حمل	تیسرا حضرت عمرؓ نے اور چوتھا پھر حضرت عثمانؓ
عثمان حجرا آخر فقلت یا رسول اللہ	نے رکھا، میں نے کہا اللہ کے رسول دیکھیے

الا ترى الى هؤلاء كيف يساعدونك	کس طرح یہ لوگ آپ کی معاونت کررہے ہیں
فقال يا عائشة هؤلاء الخلفاء	آپ نے فرمایا اے عائشہ یہی لوگ میرے بعد
من بعدی	میرے خلفاء اور جانشین ہوں گے۔

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبی وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پرواہ کیے بغیر ایسی حدیث کی تخریج کرسکتا ہے جو خلفائے ثلثہ کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارہ میں رفض و تشیع کا گمان بھی کیا جاسکتا ہے؟

حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ

عن جابر بن عبد الله رضی الله	حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے
عنهما قال بينما نحن فی بيت ابن	کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے جس میں
حشفة فی نفر من المهاجرين فيهم	حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبد الرحمن
ابوبكر وعمر وعثمان وعلی وطلحة	ابن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے
والزبير وعبد الرحمن بن عوف	ساتھ ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع پر)
وسعد بن ابی وقاص رضی الله عنهم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص
فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم	کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور
لينهض كل رجل منكم الی كفوه	آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہوکر
فنهض النبی صلی الله علیه وسلم الی	ان سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا
عثمان فاعتنقه وقال انت ولی	وآخرت دونوں میں ولی ہو۔
فی الدنيا والآخرة	

اس میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک و اعتراض کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ کے فضائل و مناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو و اغراق سے کام نہیں لیتے تھے، جو بدعت یا دوسرے صحابہ کے سب و شتم کا باعث ہو......[1]

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارہ میں غالی و مفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابلِ اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے، کیونکہ (۱) انھوں نے خلفائے اربعہ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے، جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلثہ کا اور انکے بعد حضرت علیؓ کا تذکرہ ہے،

ایک جگہ معرفت علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:۔

النوع السابع من هذا العلم	اس علم و فن کی ساتویں نوع صحابہ کرام
معرفة الصحابة علی مراتبهم	کے مراتب کے لحاظ سے ان کی معرفت ہے

اس نوع میں انھوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ[2] طبقوں کا ذکر کیا ہے پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں:۔

فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل	اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں
ابی بكر وعمر وعثمان وعلی وغيرهم	اسلام لائے جیسے ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ
رضی الله عنهم[2]	و علیؓ وغیرہ

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۰، ۱، [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۲

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انھوں نے خلفائے ثلٰثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سنہ وفات تحریر کیا ہے[1]۔

(۲) عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے اور اپنی تصنیفات میں خلفاء کی حیثیت سے اُن کا ذکر بھی کیا ہے۔

(۳) ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کیے ہیں ان سے بھی ان کی فضیلت وعظمت اور ان کا وہی درجہ ومرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا، یعنی حضرت ابوبکرؓ جو متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ و برتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث وآثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا سب سے فائق و برتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں جناب امیرؓ کی تاخیر اور آپ کی آزردگی کا مسئلہ آج تک امت کے درمیان بحث ونزاع کا موضوع بنا ہوا ہے، لیکن حاکم جناب امیرؓ ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال علی والزبیر ما غضبنا الا	حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو
لانا قد اخرنا عن المشاورۃ	غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم لوگوں کو مشورہ
وانا نری ابابکر احق الناس بھا	میں نظر انداز کیا گیا تھا ورنہ ہم لوگ بھی
بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت
انہ لصاحب الغار وثانی اثنین	ابوبکرؓ ہی کو سب سے زیادہ خلافت کا مستحق
وانا لنعلم بشرفہ وکبرہ ولقد	سمجھتے تھے، وہ غار میں آپ کے ساتھی اور دو
امرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں کے دوسرے تھے، ہم کو ان کا فضل وشرف

[1] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۲ و ۲۰۳

بالصلوۃ بالناس وھو حی[1]	خوب معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

جہاں تک شیخینؓ کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے انکے متعلق کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمانؓ کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے، حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنیؓ کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے، اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:-

قتل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ صبرا[2]	حضرت عثمانؓ مظلوم قتل کیے گئے تھے۔

خلافت میں حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں، وہ مستدرک میں بھی ہیں، علامہ ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں، یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:-

"حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ رات ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہؐ سے اور ان سے حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ سے حضرت عثمانؓ جڑ گئے، راوی (حضرت جابرؓ) کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلعم کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صالح آدمی سے خود رسول اللہ صلعم مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے امور کے ذمہ دار ہونگے"[3]

دوسری حدیث حضرت انسؓ بن مالک کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:-

"بنی مصطلق کے لوگوں نے مجھکو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپ کے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کو، ان لوگوں

[1] المستدرک ج ۳ ص ۶۶ و ۶۷ [2] معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۲ [3] مستدرک ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲

نے کہا جاکر پھر پوچھو کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد کس کو دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا، تیسری
دفعہ پھر بھیجا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا[1]"

اسی طرح حاکم نے حضرت علیؓ کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں، ان سے خلفائے ثلثہ اور عام
صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابۂ کرام کی عدالت میں طعن اور انکی تنقیص
کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت کے بیان میں لکھتے ہیں:

"علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں کہ ابو اسرائیل ملائی کا پایہ حدیث میں بلند نہیں تھا، کیونکہ وہ حضرت
عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے"

اسی طرح علی بن حسین سے روایت کی ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس لیے ترک کردیا
تھا کہ وہ شیخین کو سب و شتم کرتے تھے[2]۔

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہ کے معاملہ میں جادۂ حق اور مسلک اعتدال
سے منحرف نہیں تھے، جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انھوں نے بھی اس کے ثبوت میں کوئی
واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں روایتیں جو
صاحب مستدرک کے رفض و تشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی اس کا کوئی
ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کی حاکم نے تین طرق سے تخریج کی ہے
اور سب کی تصحیح و تصویب کی ہے[3]، ان کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہؒ
نے اپنی سنن میں اور امام احمدؒ نے مسند میں اس حدیث کی تخریج کی ہے، ان کے علاوہ طبرانی

---

[1] مستدرک ج ۳ ص ۷۷، [2] معرفة علوم الحدیث ص ۱۳۰، [3] ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۰۹، ۱۱۰

نے معجم میں، ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ میں اسکی تخریج کی
ہے، گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے، اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے
ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث،
وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی من کنت مولاہ فعلی مولاہ" وہ
سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار
دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جابجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی
باب یعنی فضائل علیؓ کی متعدد ضعیف و واہی حدیثوں پر تنبیہ کی ہے جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ
بہت تیز و تند ہو گیا ہے، مثلاً

العجب من الحاکم وجرأته فی تصحیح هذا وامثاله من البواطیل[1]	حاکم پر اور انکی ایسی اور اس جیسی حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت حیرت ہے۔

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انھوں نے
کوئی کلام نہیں کیا ہے[2]، اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح اور موضوع
حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارہ میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ

واما حدیث من کنت مولاہ الخ فله طرق جیدة وقد افردت ذالک[3]	رہی حدیث من کنت مولاہ الخ تو اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس کے لیے علحدہ رسالہ لکھا ہے۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجرؒ نے لسان المیزان میں حاکم کی ساقط
روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ضعاف و موضوعات میں جو

---

[1] و [2] تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۶، ۱۱۰ [3] تذکرة الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵

کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے[1] البتہ امام ترمذیؒ نے اس کو غریب بتایا ہے، مگر مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوریؒ لکھتے ہیں:

"امام ترمذی کا یہ قول کہ "یہ حدیث حسن غریب ہے" محل نظر ہے، کیونکہ امام احمد، نسائیؒ اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ سے اور انھوں نے اور ابن ماجہ نے براء بن عازبؓ سے اور امام ابن ماجہ نے سعد بن ابی وقاص سے اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں۔"[2]

اور علامہ اسمٰعیل بن محمد عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے تو اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ

حدیث من کنت مولاہ کی امام طبرانی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں زید بن ارقم، حضرت علیؓ اور تیس صحابہ سے اس لفظ "اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ" کے ساتھ تخریج کی ہے پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے۔"[3]

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے علامہ زیلعی نے اس کے ضعیف ہونے کی نصب الرایہ میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف و موضوع، مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعی قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے، جب مستدرک میں اور بھی ضعیف اور موضوع حدیثیں موجود ہیں، اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ و مسلک کے بارہ میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہاں تک کہ خود خلفائے ثلٰثہ اور دیگر صحابۂ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی عقیدت میں غلو و افراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے، اس لیے اسی روایت کو ان کے عقیدہ و مسلک کی بنیاد اور حضرت علیؓ کی محبت میں بیجا افراط و غلو کی دلیل

[1] الجامع الصغیر ج ۲ ص ۵۵۵ [2] جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۳۲۶، ۳۲۷ [3] کشف الخفاء ومزیل الالباس ج ۲ ص ۲۷۴

کس طرح ثابت کیا جا سکتا ہے؟ پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمۂ کبار نے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض و تشیع سے متہم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعی قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اگر اس حدیث کی صحت یقینی اور مسلم بھی مان لی جائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض و شیعیت کی کوئی تائید نہیں ہوتی، عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے، یہاں مولی اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے، ملا علی قاری کا بیان ہے کہ "من کنت مولاہ الخ من کنت اتولاہ کے مفہوم میں ہے، یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں، دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی بھی محبت کرتے ہیں۔"[1] پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے جن میں حضرت علیؓ سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض و نفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے،

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابۂ کرام کے بارہ میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں، خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے، جو پہلے گذر چکی ہے کہ آپ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا و آخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علیؓ کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں۔

تیسرے بریدہ اسلمی اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورۂ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیر کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے، جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزردہ ہو کر

[1] تحفۃ الاحوذی مع جامع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۶

رسول اللہ صلعم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ علیؓ سے بغض و نفرت کا اظہار کر کے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو کیونکہ جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں،

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہی دوسری حدیث "طیر" اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کر کے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت علیؓ، ابو سعید خدریؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے[1]۔ "حدیث طیر" کا معرفۃ علوم الحدیث میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے، لیکن وہاں اس کی صحت و سقم کے بارہ میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے،

"حدیث طیر" کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع[2] میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ[3] میں نقل کیا ہے۔

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی و نسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، ناظرین کی واقفیت کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کیجاتی ہے:-

عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ	حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ
کان عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چڑیا تھی

---

[1] ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ [2] تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۸ [3] یہ رسالہ [illegible]ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں جو نواب رامپور کے مصاحب خاص و واعظ دربار تھے، خصائص مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو محلہ جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا متن اور اردو ترجمہ موجود ہے، ملاحظہ ہو خصائص مرتضوی ص ۴

طیر فقال اللھم ائتنی باحب	آپ نے فرمایا کہ اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس
خلقک الیک یاکل معی ھذا	بھیجدے جو تیرے نزدیک تیری مخلوق میں سب سے
الطیر فجاء علی فاکل معہ	زیادہ محبوب ہو، تاکہ وہ میرے ساتھ یہ چڑیا
	کھائے، چنانچہ حضرت علیؓ تشریف لائے
	اور انھوں نے آپکے ساتھ اسکو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگر ان لوگوں کو باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب حضرت علیؓ تشریف لائے تو آپنے انکو اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ما حصل یہ ہے کہ آنحضورؐ کی دعا "اللھم ائتنی الخ" سنکر حضرت انسؓ نے دعا کی کہ اے اللہ یہ محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علیؓ ہی تشریف لائے تو حضرت انسؓ نے یہ کہکر انکو واپس کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علیؓ ہی آئے تو رسول اللہؐ نے فرمایا ان کو لوا آؤ، تم ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے،

امام ترمذی نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ

ھذا حدیث غریب لا نعرفہ	یہ حدیث غریب ہے سدی سے صرف اسی
من حدیث السدی الا من ھذا	وجہ اور طریق سے ان کی حدیث کا ہم کو
الوجہ وقد روی ھذا الحدیث	علم ہے، حالانکہ یہ حضرت انسؓ سے متعدد
من غیر وجہ عن انس	وجوہ و طرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص میں حدیث طیر کے پہلے طریق کے بارہ میں لکھتے ہیں

ابن عياض لا اعرفه ولقد كنت
زمانا طويلا اظن ان حديث
الطير لم يجسر الحاكم ان يودعه
فى مستدركه فلما علقت هذا
الكتاب رأيت الهول من الموضوعات
التى فيه فاذا حديث الطير
بالنسبة اليها سماء قال وقد
رواه عن انس جماعة اكثر من
ثلاثين نفسا ثم صحت الرواية
عن على وابى سعيد وسفينة[1]

ابن عیاض کے بارہ میں مجھکو واقفیت نہیں
ہے، میرا ایک زمانہ تک خیال تھا کہ حاکم نے
حدیث طیر کو مستدرک میں نقل کرنے کی جسارت
نہ کی ہوگی، لیکن جب میں نے تعلیق لکھی تو
مجھکو ایسی ہولناک موضوع حدیثیں اس
میں ملیں جن کے مقابلہ میں حدیث طیر بلند پایہ ہے
کیونکہ اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے
کہ اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ
اشخاص نے بیان کیا ہے، اس کے علاوہ
یہ حضرت علیؓ، ابو سعیدؓ اور سفینہؓ سے بھی
صحت کے ساتھ مروی ہے۔

اور دوسرے طریق کے ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے،[2]

تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہوگیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

واما حديث الطير فله طرق كثيرة
جدا فردتها بمصنف ومجموعها
يوجب ان يكون الحديث له اصل[3]

رہی حدیث طیر تو یہ بکثرت طرق سے مروی
ہے، میں نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں
جمع کیا ہے، ان سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا
ہے کہ یہ بے اصل نہیں ہے۔

ذہبی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طیر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے

[1] تلخیص مع مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱ [2] ایضاً ص ۱۳۲ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵

بارہ میں شرح صدر نہیں تھا، اور امام ترمذی نے اگرچہ اس کو غریب بتایا ہے، تاہم انھوں نے اس کے کثرت طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علماء نے حدیث طیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے، جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"حدیث طیر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی علائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، ذہبی نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ ومعروف بتایا ہے، لیکن میری نظر سے انکی جرح یا توثیق کے بارہ میں کوئی قول نہیں گذرا ہے"[1]

علامہ زیلعی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کیجائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے، لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

"حاکم نے حدیث طیر کو صحیح بتایا ہے، لیکن ابن ناصر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول راویوں کے واسطے سے اس کو حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے"[2]

[1] طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۱، ۷۲ [2] المنتظم ج ۷، ص ۲۷۵

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔[۱]

علامہ شوکانی فرماتے ہیں :۔

قال فی المختصر له طرق کثیرة کلها ضعیفة وقد ذکره ابن الجوزی فی الموضوعات واما الحاکم فاخرجه فی المستدرک[۲] وصححه واعترض علیه کثیر من اهل العلم ومن اراد استیفاء البحث فلینظر ترجمة الحاکم فی النبلاء[۳]

مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت سے طرق ہیں جو سب ضعیف ہیں، اور علامہ ابن جوزی نے اس کا موضوعات میں تذکرہ کیا ہے مگر حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے، اس کی وجہ سے اکثر علماء نے ان پر اعتراضات کیے ہیں جس کو اس کی مفصل بحث دیکھنی ہو وہ سیر النبلاء[۳] میں حاکم کا ترجمہ دیکھے

علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے۔[۴]

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرت طرق کا سہارا لیا ہے، مگر علامہ زیلعی فرماتے ہیں :۔

وکم من حدیث کثرت رواته وتعددت طرقه وهو حدیث ضعیف کحدیث الطیر وحدیث الحاجم والمحجوم وحدیث من کنت مولاه فعلی مولاه[۵]

کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ زیادہ اور طرق متعدد ہوتے ہیں، لیکن وہ حدیث ضعیف ہوتی ہے جیسے حدیث طیر، حدیث حاجم و محجوم اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ

۱؎ البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ ۲؎ الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ص ۳۰۸ ۳؎ افسوس ہے کہ سیر النبلاء کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گذری ۴؎ تذکرۃ الموضوعات ص ۹۵ و ۹۶ ۵؎ نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۶۰

امام دار قطنی کے بارہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار نکیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھ کر مستدرک سے خارج کر دیا تھا، ابو محمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ "حاکم کو حدیث طیر کے متعلق جب امام دار قطنی کی نکیر و ملامت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا"۔[۱]

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"حاکم کے شاگرد ابو عبد الرحمن شاذیاجی کہتے ہیں کہ سید ابو الحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارہ میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہؐ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؓ سے افضل نہ ہوگا"۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی، اور انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا تھا"۔[۲]

۱؎ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۸ ۲؎ دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۵، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حاکم نے اس حدیث کو مستدرک سے خارج کر دیا تھا تو وہ کس طرح اس میں باقی رہ گئی ہے، علامہ ابن سبکی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں "ہمارے استاذ علامہ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا رہ جانا ناسخ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھ کو اس سلسلے میں شرح صدر نہ ہوا، مگر جب امام دار قطنی کے استدراک و نکیر اور حاکم کے اس سے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج کر دینے کی بات یاد آئی تو خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ چھوٹ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہو جائے تو دونوں روایتیں

(باقی حاشیہ ص ۱۸۰ پر)

بہر حال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔

گو محدثین اور اصحاب فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلم ہے، لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ اس سے حضرت علیؓ کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام

امام حاکم شافعی المذہب تھے۔ ان کے الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بیجا غلو اور تعصب تھا، لیکن اس الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المصنفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شد و مد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف "ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ" میں تحریر فرماتے ہیں:-

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) درست ہو جائیں گی، اور صورت واقعہ یہ ہوگی کہ حاکم نے اس حدیث کے بطلان کے علم سے پہلے اس کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا باطل ہونا معلوم ہو گیا تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا جیسا کہ اس روایت سے جس کی سند وں کو ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے مشتہر اور شائع ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینوں نے اسکو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۷) علامہ ابن سبکی نے مخالفین کے بارہ میں جس شبہہ کا اظہار کیا ہے وہ بے بنیاد نہیں ہے، خود ابن طاہر کا بیان ہے کہ "میں نے حاکم کے قلم سے ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طیر دیکھی تو اسکو تعجب کی وجہ سے نقل کر لیا۔" ممکن ہے اسی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح سے اسکو عام شہرت ہو گئی ہو، اور جن لوگوں کو حاکم کی بعد کی رائے کی اطلاع نہ ہو سکی انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ حدیث مستدرک میں شامل ہے، اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اسلئے جامعین و مرتبین سے عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہو گیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی ہو۔

"علامہ ابن صلاح نے ائمۂ خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی) کے بعد جن کابر محدثین کا ذکر کیا ہے یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن سعید مصری، ابونعیم اصبہانی اور ان کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر، بیہقی اور خطیب، یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمۂ شافعیہ میں ہیں اور ان لوگوں کو اس مذہب کے بارہ میں شدید تعصب تھا،

حافظ ابن جوزی المنتظم میں لکھتے ہیں:-

اسمٰعیل بن ابوالفضل تومسی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین ...... کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے، (۱) حاکم ابوعبداللہ (۲) ابونعیم اصبہانی (۳) ابوبکر خطیب، اسمٰعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ و صدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو رجال و متون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی، اور وہ بڑے متدین تھے۔"[1]

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت کی ہے، لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے، مگر حاکم کے رسالہ المدخل پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح و تفصیل کے علاوہ اس پر نقد و تعقب بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

"حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اولاً ان کا نقد و نظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے، مگر تعصب پر ممکن ہے ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے، لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں بلکہ ائمۂ فن کی تصریح ہے، حافظ

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۳۱ بحوالہ المنتظم ج ۸ ص ۲۶۹

عبد الرحمٰن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسمٰعیل بن ابی الفضل قومسی کا یہ قول نقل کیا ہے..........[1]

المدخل میں بھی ائمۂ احناف کا جس طریقہ پر ذکر کیا ہے اس سے حافظ اسمٰعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفاء سے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت شان کے ساتھ کیا ہے "وهذا مالك بن انس امام اهل الحجاز بلا مدافعة" ۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں" وهو الامام لاهل الحجاز بعد مالك"۔ لیکن امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے صرف نام بتانے پر اکتفا کی ہے، چنانچہ تحریر ہے" وهذا ابو حنيفة ثم بعده ابو يوسف يعقوب بن ابراهيم القاضي ومحمد بن الحسن الشيباني" اور ابو عصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابو حنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہا میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے، اور ایک مجہول شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے[2]۔

مذکورۂ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) رسالۂ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا نہیں کیا ہے۔

(۲) حاکم نے امام ابو حنیفہ کے ایک شاگرد ابو عصمہ نوح بن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے[3]، لیکن غالباً اس کو امام اعظم کی تنقیص اور شافعیت میں غلو و تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ

---

[1] یہ بیان پہلی تحریر میں گذر چکا ہے اس لیے اسکو یہاں حذف کر دیا گیا ہے [2] ماہنامہ برہان فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۰۳، ۱۰۴ [3] المدخل: ۰

(۱) امام اعظم کے بارہ میں معتدل محدثین کو اگرچہ یہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت و حدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے[1]۔ یہ خیال خواہ تمامتر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو، لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمۂ ثلاثہ خصوصاً امام مالک اور امام احمد کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمۂ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہمنوا بھی، اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا نہیں کرتے، لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظم کا مخالف و معاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کے مقابلہ میں امام ابو حنیفہ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیت میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے،

(۲) حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابو حنیفہ کو صرف فقہ و اجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ حدیث و روایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے، چنانچہ یہاں بھی سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام مالک و امام شافعی کی طرح ان کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمہ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ ابتدا "فمن الائمة الماضين" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد "ذلك من بعدهما من ائمة المسلمين" سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفت حدیث سے انکار نہیں تھا، لیکن امام شافعی و امام مالک کے ناموں کے ساتھ انھوں نے جو توصیف و تکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو

---

[1] اس کے متعلق مفصل بحث راقم کے مضمون "کیا امام دارقطنی، امام ابو حنیفہ سے تعصب رکھتے تھے" مطبوعہ معارف ستمبر ۶۹ء میں ملے گی۔

بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث و روایت میں امام سمجھتی تھی، لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے،

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:۔

"حاکم اپنی مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں، اور ان کو ائمہ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انھوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں[49] نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین و تبع تابعین میں ذکر کیا ہے، جن کی حدیثیں حفظ و مذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں، اور جن کا مشرق و مغرب میں شہرہ ہے"[1]

(۳) حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو اصلی غلو، جیسا کہ مولانا نے لکھا ہے، اسی مذہب سے ہوگا، لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان ...... بنا پر اگر کوئی الزام عائد ہوسکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعیت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث و روایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھکر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ در اصل ان کے تعصب کا نہیں بلکہ انصاف پسندی کا نتیجہ ہے۔

(۴) اس عبارت میں جس طرح انھوں نے امام اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے، اسی طرح کتاب کے دوسرے مقامات و مباحث میں حدیث و روایت کے کئی اساطین و اکابر جیسے امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دیدیا ہے۔

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم اور صاحبین کا بھی اسی تعریف و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا، ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا بھی ہو مگر بعد میں جب حق بندی کی جگہ عصبیت نے لے لی ہو تو ناقلین نے اسے حذف کر دیا ہو۔

رہا دوسرا جزء تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابوعصمہ کے متعلق المدخل میں بہ ضرور لکھا ہے کہ

"بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت و تلقین کرنے کے لیے ایسا کیا، جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبداللہ جوباری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبداللہ ہروی وغیرہ .... میں نے محمد بن یونس مقری سے انھوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انھوں نے ابوعمارہ مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوعصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے، جس کو انھوں نے عبداللہ بن عباسؓ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور روگرداں ہوکر امام ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحٰق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کر ڈالی"[1]

مگر ابوعصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے، کم و بیش تمام ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو غیر ضابطہ، منکر الحدیث اور واضع و کذاب تک کہا ہے، ان کے بارہ میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، اگرچہ وہ کہتے ہیں "ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں

---

[1] المدخل ص ۱۹ و ۲۰ ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نوح کا یہ بیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "وایں مذہب بدتر از گناہ است زیرا کہ احادیث صحیحہ کہ در فضائل قرآن وارد شدہ برائے ترغیب کافی بودہ۔"
(عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی"
اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے، وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے اور انھیں وضعی وجعلی قرار دیتے تھے، ایک بار وکیع سے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک شیخ ہیں، ان کا نام ابوعصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلی بن ہلال کرتے تھے

ابوعصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادان فن کے اقوال اور جرحیں درج کیجاتی ہیں۔

امام احمد :- وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے، بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحیی ابن معین :- نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ انکی حدیثیں لکھی جائیں گی۔

وکیع :- ان کا کیا اعتبار؟ ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے،

امام بخاری :- ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث وذاہب الحدیث ہیں۔

ابوحاتم، دولابی، امام مسلم اور امام دارقطنی :- متروک الحدیث

ابوزرعہ :- ضعیف الحدیث۔

امام نسائی :- ابوعصمہ غیر ثقہ وغیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث نہیں لکھی جائیگی۔

جوزجانی :- ساقط الحدیث

ابن حبان :- ابوعصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کرکے حدیثیں بیان کرتے تھے، وہ کسی حال میں بھی اعتبار واحتجاج کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن عیینہ وابوعلی نیشاپوری :- وکذاب تھے۔

خلیلی :- ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی :- متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتی تھیں۔

ابوسعید النقاش :- انھوں نے موضوعات کی روایت کی ہے۔

حافظ ذہبی وابن عماد :- متروک الحدیث، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور واہی حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

حافظ ابن حجر :- لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے، انھوں نے زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدلیس سے کام لیتے تھے

ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے، واقعتہً اس میں وضع کے آثار وعلامات بالکل ظاہر وواضح ہیں، ابوجعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتداء میں بدأ الخلق کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورۂ بالا بیان بلانقد وتبصرہ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے[1]۔

ائمۂ جرح وتعدیل کے ان متفقہ آراء واقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ حاکم نے بربنائے تعصب نوح کو واضعِ حدیث قرار دیا ہے، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطے سے بھی ہو تو ان آراء کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی رد وکد نہیں کیا ہے، اور تو اور مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو غالباً مولانا عبدالرشید صاحب سے قریب متعلق ہیں، ابوعصمہ کے ضعیف ومتروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"نوح بن ابی عصمہ نے امام زہری، ثابت بنانی، یحیی ابن سعید انصاری اور ابن ابی لیلی وغیرہم

---

[1] ائمۂ جرح وتعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۵، تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۷ تا ۴۸۹ تقریب التہذیب ص ۳۶۴، خلاصۃ تذہیب ص ۴۰۵، العبر ج ۱ ص ۲۶۴، التاریخ الصغیر امام بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی ملاحظہ ہو۔

سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہا اللہ راوی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے، لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں، ان پر زہد کا بڑا غلبہ تھا، ...... حافظ ذہبی کتاب العبر میں لکھتے ہیں ...... وہو متروک الحدیث (یہ متروک الحدیث ہیں) (فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۵۲۴ و ۵۲۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسمٰعیل بن ابوالفضل توسی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے، جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدد شخص نے المنتظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے، لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟ جنھوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات بھی گنائے، مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا، مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ دیگر ائمہ اور ناقلین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم اسکے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے "ظاہر بینوں" کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہو جاتا۔

مستدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی ہے لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اس طرح کے بعض مواقع پر انھوں نے امام شافعی کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسالک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

(ایک اجمالی جائزہ)

حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی، رفیق دارالمصنفین

(۳)

مذکورۂ بالا جائزہ سے آٹھویں صدی ہجری بالخصوص اس کے آخری عہد کی علمی سرگرمیوں کا سرسری اندازہ ہو جاتا ہے، اس دور میں جن فضلاء نے علم و دانش کی شمعیں فروزاں کیں اُن میں سے اگر مشاہیر ہی کے سوانح و کارناموں کی تفصیل بیان کیجائے تو ایک مستقل ضخیم تصنیف تیار ہو سکتی ہے، ہم ذیل میں صرف ان چار ائمۂ فن کے حالات اور علمی کارنامے پیش کرتے ہیں جنھیں علامہ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ میں "اعجوبۂ روزگار" اور "یکتائے عہد" قرار دیا ہے۔

سراج الدین ابن الملقن

نام و نسب عمر نام، ابوحفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا، پورا نسب نامہ یہ ہے: عمر بن علی بن احمد بن محمد بن عبداللہ[1]، ابن الملقن اور ابن النحوی دونوں عرفیتیں ہیں، ان میں اول الذکر کو زیادہ شہرت حاصل ہے،[2]

عرفیت کی وجہ تسمیہ جب شیخ ابن الملقن ایک ہی سال کے تھے، ان کے والد داغ مفارقت دے گئے، انتقال کے وقت انھوں نے اپنے صغیر السن لڑکے کو شیخ شرف الدین عیسی

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۱۹۷ و شذرات الذہب ج ۷، ص ۹۴

المغربی کی کفالت میں دیدیا تھا، جو نہایت صالح بزرگ تھے، اور جامع ابن طولون میں قرآن پاک کی تلقین (تعلیم) دیتے تھے، بعد میں انھوں نے شیخ سراج الدین کی والدہ سے عقد بھی کر لیا تھا، شیخ سراج الدین نے انہی کے آغوش تربیت میں نشوونما پائی، اور اسی نسبت سے ابن الملقن مشہور ہو گئے[۱]۔

حافظ سخاوی کا بیان ہے کہ شیخ ابن الملقن اس عرفیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور خود اپنے قلم سے اس کو لکھنا گوارا نہ تھا، اور عموماً وہ اپنے نام کے ساتھ عمر بن ابی الحسن النحوی لکھا کرتے تھے، کیونکہ ان کے والد علم نحو کے بہت ماہر تھے، یمن میں ان کی اسی عرفیت (ابن النحوی) کو شہرت حاصل ہوئی[۲]،

مولد اور وطن اصلاً ان کا تعلق اندلس کی وادی آش سے تھا، ان کے والد وقتاً فوقتاً نقل مکانی کرتے رہے، چنانچہ پہلے وہ اندلس سے افریقہ کے شہر تکرور آئے اور وہاں عرصہ تک تدریس و تعلیم میں مصروف رہے، پھر قاہرہ چلے گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی[۳]، یہیں ۲۴ ربیع الاول ۷۲۳ھ کو شیخ ابن ملقن پیدا ہوئے[۴]، علامہ سخاوی کا بیان ہے کہ میں نے شیخ کے قلم سے ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ ربیع الاول لکھی ہوئی دیکھی ہے، اسلیے اسی کو مرجح قرار دیا جائے گا[۵]،

تحصیل علم ان کے مربی شیخ عیسیٰ المغربی نے ابتدا ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ رکھی، پہلے خود ان کو قرآن پاک اور پھر عمدۃ الاحکام پڑھایا، اس کے بعد مقامی حفاظ حدیث سے سماع حاصل کرایا، حدیث کی طرف شروع ہی سے خاص رجحان تھا، اس لیے انھوں نے پوری محنت سے اس کی تحصیل کی، وقت کے ممتاز اور مشاہیر شیوخ حدیث

---

۱ البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۸ ۲ ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۱۹۷ و الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰ ۳ الاعلام ج ۲ ۴ شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۴ ۵ الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۰

سے سماع کے لیے دمشق وغیرہ کے سفر بھی کیے، شیخ عیسیٰ المغربی نے طلب علم میں انکے انہماک کو دیکھکر ان کی تعلیم پر بے دریغ رقم خرچ کی، حافظ ابن فہد مکی کا بیان ہے کہ

کان وصیہ انفق علیہ قریباً من ستین الف درہم[۱] — ان کے وصی نے ان پر تقریباً ساٹھ ہزار درہم کی رقم خرچ کی۔

شیوخ و اساتذہ وہ دمشق، قاہرہ، حلب، بیت المقدس کے علاوہ مصر و شام کے علمی سرچشموں سے فیضیاب ہوئے تھے، اور فقہ، حدیث، عربیت اور قرأت کے ماہرین سے ان کی سندیں اور اجازت حاصل کی، ان میں چند ممتاز اور لائق ذکر اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو الفتح بن سید الناس، قطب الدین الحلبی، تقی السبکی، جمال الدین الاسنائی، کمال النشائی، عز بن جماعہ، ابی حیان، جمال بن ہشام، محمد بن عبد الرحمن بن الصائغ، برہان الرشیدی، سلیمان الاشبیطی، اسماعیل الدنیابی، علاء الدین مغلطائی، ابو بکر ابن قاسم الرحبی، حسن بن السدید، احمد بن کشتغدی، عبد الرحمن بن عبد الہادی، محمد بن غالی، جمال یوسف المعدنی، ابو القاسم المیدومی، ابن عبد الدائم، ابن امیلہ تاج السبکی، حافظ مزی، ابن رجب، احمد بن محمد بن عمر الحلبی، احمد بن علی المستولی محمد بن احمد الفارقی، ابراہیم بن علی الزرزاری[۲]،

جلالت علمی ان مشاہیر اساتذہ کے فیض نے ان کو جامع العلوم بنا دیا، انھوں نے بلا کسی تفریق کے ہر مسلک کی کتابیں پڑھی تھیں، اس لیے حدیث نبوی سے خصوصی اعتناء کے باوجود فقہ، رجال، اور زبان دانی میں بھی یکساں مہارت رکھتے تھے، علما و محققین نے ان کے علمی مرتبہ کا پورا اعتراف کیا ہے، زرکلی لکھتے ہیں:-

---

۱ لحظ الالحاظ ص ۱۹۸ ۲ الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۱، شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۹، لحظ الالحاظ ص ۱۹۹

من اکابر العلماء بالحدیث والفقہ والرجال[1]

وہ حدیث، فقہ اور رجال کے کبار علماء میں سے تھے۔

حافظ برہان الدین العجمی کا جن سے ابن الملقن کو تلمذ کا شرف حاصل تھا، بیان ہے:۔

حفاظ حدیث اربعۃ اشخاص وھم من مشائخی، البلقینی وھو احفظھم لاحادیث الاحکام والعراقی وھو اعلمھم بالصنعۃ والھیثمی وھو احفظھم للاحادیث من حیث ھی، وابن الملقن وھو اکثرھم فوائد فی الکتابۃ[2]

چار شخص حافظ حدیث ہیں اور وہ سب میرے شیوخ میں ہیں، پہلے بلقینی جو احادیث احکام کے سب سے بڑے حافظ تھے، دوسرے عراقی جو فقہ کے سب سے بڑے عالم تھے، تیسرے ہیثمی جو احادیث پر کلی عبور رکھتے تھے، چوتھے، ابن الملقن جنکی تصنیفات فوائد کا خزینہ ہے۔

امام غمازی ان کے علم وفضل کو ان الفاظ سے سراہتے ہیں:۔

شیخ الاسلام علم الاعلام فخر الانام احد مشائخ الاسلام علامۃ العصر بقیۃ المصنفین علم المفیدین والمدرسین سیف المناظرین مفتی المسلمین

وہ شیخ الاسلام، فاضل وقت، فخر خلائق شیخ دوران، علامۂ زمن، رئیس المصنفین مفتی مسلمین اور مناظرین کی تلوار تھے۔

قاضی صفد طبقات الفقہا میں رقمطراز ہیں:۔

انہ احد مشائخ الاسلام

وہ اسلام کے کبار شیوخ میں سے تھے

---

[1] الاعلام ج ۲ ص ۳، [2] لحظ الالحاظ ص ۲۰۱ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴

صاحب التصانیف التی ما فتحت علی غیرہ بمثلھا فی ھذہ الاوقات[1]

اور انھوں نے ایسی تصانیف یادگار چھوڑیں جن کے مثل اس زمانہ میں کسی نے نہیں لکھیں

علامہ ابن حجر عسقلانی کو ان پر شدید نقد وجرح کے باوجود یہ اعتراف کرنا پڑا

ان العراقی والبلقینی وصاحب الترجمۃ (ابن الملقن) کانوا اعجوبۃ ذلک العصر۔ الاول فی معرفۃ الحدیث وفنونہ والثانی فی التوسع فی معرفۃ مذھب الشافعی والثالث فی کثرۃ التصانیف[2]

بلاشبہ عراقی، بلقینی اور ابن الملقن اس زمانہ کے اعجوبۂ روزگار ہیں، اول حدیث ومتعلقات کی معرفت میں، دوسرے مذہب شافعی کی واقفیت میں اور تیسرے کثرت تصانیف میں

درس وافتاء | شیخ ابن الملقن نے مختلف مقامات پر درس وافتاء کی مجلسیں بھی آراستہ کیں۔

ابن عماد حنبلی کا بیان ہے:

تصدی للافتاء والتدریس دھرا طویلا[3]

وہ ایک زمانہ دراز تک تدریس وافتا کے صدر نشین رہے۔

۷۶۳ھ میں شیخ ابو سعید احمد الہکاری کی وفات کے بعد جامع حاکم[4] میں تشنگان علم

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴، [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۱۱ [3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵

[4] جامع حاکم کی بنیاد عزیز باللہ بن المعز نے رکھی اور حاکم بامر اللہ کے ہاتھوں ۳۹۳ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی، پہلے اس کا نام جامع الخطبہ تھا، لیکن اب جامع حاکم ہی کے نام سے مشہور ہے، یہ مسجد ۷۰۲ھ کے ہولناک زلزلہ میں تقریباً منہدم ہو گئی تھی، سلطان بیبرس نے اس کی از سر نو تعمیر کی، اور اس میں مذاہب اربعہ کے درس کا اہتمام کیا۔ (حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۱۳۹)

کو اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا، اس کے بعد دار الحدیث الکاملیہ[1] میں قال اللہ وقال الرسول کے نغمے سنائے، اس درسگاہ کے شیخ الشیوخ امام زین الدین العراقی کے ۷۸۷ھ میں مدینہ کے منصب قضا پر مامور ہونے کے بعد شیخ ابن الملقن دار الحدیث الکاملیہ کے منصب صدارت پر فائز ہوئے، اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی[2]، یہاں وہ افتاء کا وظیفہ بھی انجام دیتے تھے،

حافظ ابن حجر کا نقد حافظ ابن حجر نے شیخ ابن الملقن پر بڑی سخت تنقید کی ہے، وہ نہ صرف حدیث میں ان کے عدم اتقان کے قائل ہیں، بلکہ شیخ کے تلامذہ کے حوالہ سے درس و افتاء میں بھی ان کی مہارت کے منکر ہیں، اس سلسلہ میں ابن حجر کے الفاظ یہ ہیں:-

لم يكن في الحديث بالمتقن ولا	وہ حدیث میں غیر متقن تھے، ان سے
له ذوق اهل الفن وقال الذين	تحصیل علم کرنے والوں کا بیان ہے کہ وہ
قرأوا عليه قالوا لم يكن ماهراً	نہ تو افتا میں ماہر تھے اور نہ تدریس کی اہلیت
في الفتوى ولا التدريس وانما	رکھتے تھے، اکثر ان کے روبرو انہی کی تصنیفات
كانت تقرأ عليه مصنفاته في	پڑھی جاتی تھیں اور وہ اسی میں تقریر کرتے تھے
الغالب فيقرر ما فيها ولا	نہ تو مسائل کا استحضار انھیں حاصل تھا اور
يستحضر شيئا ولا يحقق علما	نہ علم کی تحقیق۔ ان کی اکثر تصانیف

[1] گو آج عالم اسلام میں سیکڑوں دار الحدیث قائم ہیں لیکن دار الحدیث الکاملیہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ روئے زمین کا دوسرا دار الحدیث ہے، اس سے قبل سلطان نور الدین محمود زنگی نے دمشق میں ایک دار الحدیث قائم کیا تھا، پھر سلطان کامل نے مذکورہ ادارہ کی بنیاد رکھی، اسکی تعمیر ۶۳۰ھ میں مکمل ہوئی، اس دار الحدیث کی مسند صدارت پر ابو الخطاب عمر بن دحیہ، حافظ زکی الدین منذری، محدث ابن سراقہ، تاج الدین بن القسطلانی، ابن دقیق العید، حافظ زین الدین عراقی اور شیخ ابن الملقن جیسے منتخب روزگار فضلا ذی وقار رونق افروز ہوئے (حسن المحاضرہ ج ۲ ص ۱۴۲) [2] حسن المحاضرۃ ج ۲ ص ۱۴۳

وغالب تصانيفه كالسرقة من	لوگوں کی کتابوں کا چربہ و سرقہ
كتب الناس[1]	ہیں۔

علامہ شوکانی کا بیان ہے کہ ابن حجر نے اس بیان میں انتہائی مبالغہ سے کام لیا ہے، جو ہر منصف مزاج شخص پر بادنی تامل واضح ہو جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ

انه من الائمة في جميع العلوم	وہ تمام علوم کے امام تھے، اس کی شہرت
وقد اشتهر صيته وطار ذكره	و مقبولیت اور ان کی تصنیفات چاردانگ
وسارت مؤلفاته في الدنيا[2]	عالم میں پھیل گئی تھیں۔

ابتلاء فقہی مہارت کی بناپر عدل و قضا کی مسند پر متمکن ہوئے، اور ایک طویل مدت تک اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، ۸۰۲ھ میں اس سے گلو خلاصی حاصل کرنی چاہی، بعض بدخواہوں نے صلاح دی کہ وہ شاہ سے مالی مطالبہ کریں، شیخ اپنی سادہ لوحی سے اس فریب میں آگئے، سلطان برقوق ابن الملقن سے بڑی عقیدت رکھتا تھا اور ان کی بڑی قدر و منزلت کرتا تھا، اس لیے اس مطالبہ پر شیخ کی جانب سے اس کو سوء ظن پیدا ہو گیا، اور اس کے نتیجہ میں ان کو بڑے ابتلاء و آزمائش سے گذرنا پڑا، جس سے امام اکمل الدین حنفی کی کوششوں سے نجات پائی،[3]

مناقب و فضائل علمی جلالت کے ساتھ ابن الملقن گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے، مروت، تواضع، اخلاق اور محبت و رافت ان کے خمیر میں داخل تھے، علمی و تدریسی مصروفیات کے باوجود مزاج میں عبوست نہ تھی، ہمیشہ باغ و بہار رہتے تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ

[1] البدر الطالع ج ۲ ص ۵۱۰ [2] ایضاً [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴ و ذیل طبقات الحفاظ ص ۱۹۹

کان یحب المزاح والمداعبة	وہ مزاح اور خوش طبعی کو پسند کرتے تھے
مع ملازمة الاشتغال والکتابة	اور تصنیف وتالیف وغیرہ مشاغل کے
حسن المحاضرة جمیل الاخلاق	باوجود نہایت خوش گفتار، خوش اخلاق
کثیر الانصاف [1]	اور منصف مزاج تھے۔

علامہ مقریزی جنھیں شیخ ابن الملقن کی سالہا سال کی صحبت اور تلمذ کا شرف حاصل ہے العقود الدرریہ میں رقمطراز ہیں :۔

ھو من اعذب الناس لفظاً	وہ سب سے زیادہ شیریں گفتار، خوش
واحسنھم خلقاً واجملھم	اخلاق، صاحب جمال اور باوقار
صورة واعظمھم محاضرة	تھے۔

حافظ ابن فہد مکی لکھتے ہیں :۔

کثیر المروءة والاحسان و	وہ ہر شخص کے ساتھ مروت، احسان
التواضع والکلام الحسن لکل	وسلوک، تواضع وانکسار اور شیریں
انسان [2]	زبانی سے پیش آتے تھے۔

فقراء واہل خیر کے ساتھ خاص طور سے بڑی محبت اور انکی بڑی تعظیم وتکریم کرتے تھے۔

کثیر المحبة للفقراء واھل الخیر	فقراء واہل خیر سے بہت محبت کرتے
والتبرک بھم مع التعظیم الزائد	ان سے برکت حاصل کرتے اور غیر معمولی
لھم [3]	تعظیم وتوقیر کے ساتھ پیش آتے۔

جامع حاکم میں ہر سال اعتکاف کا معمول تھا۔

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۰۰ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۴

مسلک مسلکاً شافعی تھے، فقہ شافعی میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، طبقات الفقہاء الشافعیہ کے نام سے ایک مستقل کتاب تالیف کی تھی جس میں امام شافعی کے عہد سے ۷۶۹ھ تک کے رجال شافعیہ کے تراجم ہیں۔

حلیہ دراز قامت اور نہایت حسین وخوبرو تھے۔[1]

وفات ۸۱ سال تک علم ودانش کی روشنی پھیلانے کے بعد ۱۶ ربیع الاول ۸۰۴ھ کی شب جمعہ کو قاہرہ میں راہی عالم جاوداں ہوئے، باب اسعد کے باہر مقام حوش الصوفیہ میں اپنے والد کی قبر کے پاس سپرد خاک کیے گئے، اہل قاہرہ نے ان کی وفات پر بے انتہا رنج والم کا اظہار کیا جس سے ان کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔[2]

تصنیف وتالیف ابن الملقن کے صحیفۂ کمال کا سب سے درخشاں باب کثرت تصانیف ہے، اس میں ان کی مثالیں کم ہیں، حافظ ابن حجر تک اپنی نقد وجرح کے باوجود انھیں اس حیثیت سے آٹھویں صدی کا اعجوبہ قرار دیتے ہیں۔[3] انھیں عنفوان شباب ہی سے تصنیف وتالیف کا ذوق تھا، حافظ سیوطی لکھتے ہیں کہ نوجوانی ہی میں وہ اپنے زمانہ کے علماء میں کثرت تصانیف کے اعتبار سے ممتاز ہو گئے تھے،[4] پھر جب منصب قضا سے سبکدوش ہوئے تو پوری توجہ سے اس کام میں لگ گئے، علامہ ابن فہد مکی کا بیان ہے :

...... فاخذ فی التصنیف	وہ ہمہ تن تصنیف وتالیف میں لگ گئے اور
واکب علیہ فکان فرید الدھر	بہترین عبارت وحسن بیان اور کثرت
فی کثرة التصانیف احسنھا	تصانیف میں یگانۂ روزگار رہے۔
بعبارة جلیة حسنة	

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [2] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵ ولحظ الالحاظ ص ۱۹۵ [3] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵ [4] حسن المحاضرة ج ۱ ص ۱۸۶

حدیث وفقہ وغیرہ علوم میں ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد تین سو کے قریب ہے
بعض علماء کا خیال ہے کہ ان میں خود تصنیف و تالیف کی اہلیت وصلاحیت نہ تھی، اور انکی
بیشتر کتابیں دوسرے مصنفین کا سرقہ ہیں، لیکن عقلاً بھی یہ خیال صحیح نہیں ہے، اور شوکانی
وغیرہ محققین نے بھی اس کی پوری تردید کی ہے۔[1]

ان کی اہم تصنیفات حسب ذیل ہیں:

تخریج احادیث الرافعی (۷ جلدیں)، المحرر المذہب فی تخریج احادیث المہذب (۴ جلد)
شرح العمدہ المسمی بالاعلام (۳ جلد)، طبقات الفقہاء الشافعیہ، طبقات المحدثین، شرح المنہاج
(۶ جلد)، شرح التنبیہ (۴ جلد)، شرح الحاوی الصغیر (۲ جلد)، المقنع فی علوم الحدیث،
شرح بخاری (۲۰ جلد)، شرح زوائد مسلم علی البخاری (۴ جلد)، زوائد ابی داؤد علی الصحیحین (۲ جلد)
زوائد ابن ماجہ علی الخمسہ (۳ جلد)، شرح التبریزی، اکمال تہذیب الکمال (اس میں احمد، ابن خزیمہ
ابن حبان، دارقطنی، حاکم کے تراجم ہیں)، الخصائص النبویہ، طبقات القراء، طبقات الصوفیہ،
شرح الفیہ ابن مالک، البدر المنیر فی تخریج احادیث الشرح الکبیر (۶ جلد)، شرح الاربعین النوویہ
افراد مسلم وابی داؤد، تحفۃ المحتاج الی ادلۃ المنہاج (۸ جلد)، شرح منہاج البیضاوی،
الاشباہ والنظائر۔

تذکرہ فی علوم الحدیث۔ اصول حدیث میں ایک مختصر رسالہ ہے، اس میں مؤلف
نے اپنی طویل کتاب مقنع سے اخذ واستفادہ کیا ہے، مصنف کی تصریح کے مطابق یہ صرف
دو گھنٹوں میں لکھا گیا ہے،

فرغت من تحریر هذه التذکرة — میں نے ۲۰ جمادی الاولی بروز جمعہ کو ۷۶۳ھ
فی نحو ساعتین من صبیحة — اس یاد داشت کی تحریر سے دو گھنٹہ

[1] البدر الطالع ترجمہ ابن الملقن

یوم الجمعة سابع عشرین من جمادی الاولی سنة ثلاث وستین وسبعمائة — میں فراغت پائی۔

اس کا ۱۲۳۲ھ کا ایک مخطوطہ کتب خانہ رام پور میں موجود ہے۔

عجالۃ المحتاج الی توجیہ المنہاج۔ یہ امام نووی (۶۷۶ھ) کی مشہور تصنیف
"منہاج الطالبین" کی شرح ہے جو شافعی مذہب کے مطابق فقہی کتاب ہے، اس کی بہت سی
شروح لکھی گئی ہیں، ابن الملقن نے بھی زیر نظر شرح کے علاوہ "منہاج" کی دو شرحیں
اور بھی تحریر کی ہیں، اس میں کتاب الطہارۃ سے کتاب امہات اولاد تک کی نہایت
خوش اسلوبی سے شرح لکھی گئی ہے، سنہ تصنیف ۷۶۳ھ، تعداد صفحات ۵۹۰۔
رام پور کے کتب خانہ میں اس کا ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے۔

ان کے علاوہ مزید کتابوں کی تفصیل سخاوی کی الضوء اللامع، شوکانی کی البدر الطالع
اور ابن فہد کی لحظ الالحاظ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

ایک عظیم المیہ

عمر کے آخری حصہ میں ان کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آگیا جو نہ صرف انکی
موت کا سبب بنا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے علمی خسارہ تھا، شیخ ابن الملقن عمدہ کتابوں
کے بڑے شائق تھے، ان کے پاس بکثرت کتابیں جمع تھیں، ان میں کچھ تو ان کی ذاتی تھیں
اور کچھ مدارس سے مستعار لی تھیں، ایک دن ان کے مکان میں آگ لگ گئی جس پر کوشش
کے باوجود قابو حاصل نہ کیا جا سکا، اس آتش زدگی میں نہ صرف ان کتابوں کا بڑا ذخیرہ
جل کر خاکستر ہو گیا، بلکہ شیخ کی تصانیف کے اکثر مسودات بھی ضائع ہو گئے، اور اب
شیخ کی کثرت تصانیف کا ذکر صرف طبقات وتراجم کی کتابوں میں ملتا ہے۔

اس المیہ کا شیخ کے اعصاب پر بہت شدید اثر ہوا اور وہ دماغی توازن

کھو بیٹھے، اور وفات تک مکان ہی میں گوشہ گیر رہے[1]، ابن عماد حنبلی کا بیان ہے

کان ذهنه مستقیما قبل ان	کتابوں کے جلنے سے پہلے ان کا
تحترق کتبه ثم تغیر حاله	دماغ درست تھا، پھر اسکے بعد
بعد ذالك[2]	حالت بگڑ گئی۔

عمر بن رسلان بلقینی

نام و نسب عمر نام، ابو حفص کنیت اور سراج الدین لقب تھا[3]، نسب نامہ یہ ہے:
عمر بن رسلان بن نصیر بن صالح بن احمد بن محمد بن شہاب بن عبد الخالق بن محمد ابن مسافر[4]، وطن مالوف بلقین کی طرف منسوب ہو کر بلقینی کہلاتے ہیں،

ولادت ۱۲ شعبان ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء کو مصر کے مشہور مقام بلقین میں پیدا ہوئے[5]، علامہ سیوطی نے شعبان کے بجائے رمضان لکھا ہے[6]، لیکن اکثر تذکروں سے اول الذکر ہی کی تائید ہوتی ہے۔ ان کے اجداد میں سب سے پہلے صالح بن احمد نے بلقین میں سکونت اختیار کر لی تھی،

نشو و نما انھوں نے ابتداءً بلقین ہی میں نشو و نما پائی اور سات سال کی عمر میں کلام پاک حفظ اور فقہ میں المحرر، اصول میں مختصر ابن الحاجب قرات میں شاطبیہ اور نحو میں الکافیہ لابن مالک کو بھی زبانی یاد کر لیا، ۷۳۶ھ میں جب ان کی عمر بارہ سال کی تھی، ان کے والد انھیں اپنے ہمراہ قاہرہ لے آئے، جو اس وقت

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۱۰۵ [2] شذرات الذہب ج ۷ ص ۴۵ [3] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵
[4] نظم العقیان ص ۱۱۶ و لحظ الالحاظ ص ۲۰۷ [5] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [6] ایضاً

علما و اصحاب کمال کا بہت بڑا مرکز شمار ہوتا تھا۔ شیخ بلقینی نے یہاں کے شیوخ سے پورا استفادہ کیا، پھر وطن واپس گئے، اگلے سال ۷۳۸ھ میں دوبارہ قاہرہ گئے اور وہیں کے ہو رہے[1]۔

تحصیل علم اس کے بعد قاہرہ اور دمشق وغیرہ کے علمی سرچشموں سے فیض حاصل کیا، سب سے پہلے فقہ، اصول، فرائض اور نحو کی تحصیل کی اور ان میں اس قدر کمال پیدا کیا کہ اپنے ہمعصروں سے آگے نکل گئے، پھر حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بھی اپنے عہد کے ممتاز حافظ حدیث شمار ہوئے،

شیوخ شیخ بلقینی کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست بہت طویل ہے، انھوں نے ہر فن کے نامور ائمہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، چنانچہ فقہ میں شیخ تقی الدین السبکی، شمس الدین ابن عدلان، محمد بن القماح، نجم الدین بن الاسوانی، زین الدین الکنانی، اور عز بن جماعۃ، اصول میں شمس الدین الاصبہانی، حدیث میں شمس الدین، محمد بن القماح، محمد بن غالی، شہاب بن کشتغدی، ابو الفرح بن عبد الہادی، حسن بن السدید، اسماعیل بن ابراہیم التفلیسی، عبد الرحیم بن شاہد الجیش، ابو الفتح المیدومی، ابو اسحاق ابراہیم الخلیی، ابو العباس احمد ابن محمد الحلبی، اور نحو و ادب میں ابو حیان اور ابن عقیل کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کی، علاوہ ازیں حافظ مزی، ذہبی، حزری اور ابن نباتہ وغیرہ اکابر مشائخ وقت نے انھیں سند اجازہ عطا کی تھی[2]

درس حصول کمال کے بعد مصر کی متعدد قدیم درسگاہوں میں درس و افادہ کی مجلسیں گرم کیں، جامع عمرو[3] کے مدرسہ خشابیہ میں تقریباً تیس سال اور جامع ابن طولون[4] میں ایک

---

[1] الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۵ [2] ایضاً [3] جامع عمرو بن العاص اپنی عظمت و شان کی بنا پر تاج الجوامع کے نام سے مشہور تھی، ۲۱ھ میں اس کی تعمیر ہوئی، کہا جاتا ہے کہ

(باقی ص ۲۰۲ پر)

عرصہ تک تفسیر وحدیث کا درس دیتے رہے[1]، مدرسہ حجازیہ اور مدرسۃ الخروبیہ میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں[2]، ان کے درس سے ایک مخلوق فیضیاب ہوئی، انکا درس گوناگوں خوبیوں کا حامل تھا، وہ ایک ایک حدیث کی شرح وتوضیح میں گھنٹوں صرف کرتے تھے، بغیر پوری تیاری اور مطالعہ کے درس نہ دیتے تھے، سخاوی کا بیان ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۱) اسی صحابۂ کرام نے مل کر اس کے سمت قبلہ کو درست کیا تھا، جن میں حضرت زبیر بن العوامؓ، مقداد بن الاسودؓ، عبادہ بن الصامتؓ، ابو الدرداءؓ، ابوذرؓ، ابو بصرہ، محمید بن جزء الزبیدی، نبیہ بن صواب، فضالہ بن عبید، عقبہ بن عامر اور رافع بن مالک وغیرہ صحابہ شامل تھے، ابتداءً اس مسجد کا طول پچاس گز اور عرض تیس گز تھا، ۳۵ھ میں اہل شہر نے حاکم مصر سلمہ بن مخلد سے اسکی تنگ دامانی کی شکایت کی، اس نے خلیفۂ وقت حضرت امیر معاویہؓ کے ایماء سے اس میں ترمیم واضافہ کیا، اسکے بعد ہر زمانہ کے حکمران اپنے اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق تعمیر وحنا فہ کرتے رہے، اس طرح پہلی صدی سے آٹھویں صدی تک (جبکہ اسکی عمارت کمال کو پہنچی)، اس تاریخی مسجد نے زمانہ کے بہت انقلابات کا مشاہدہ کیا، آخر میں اسکا طول ۲۰۰ ہزار گز ہو گیا، اس میں داخلہ کیلئے تیرہ بڑے بڑے پھاٹک ہیں (حسن المحاضرۃ للسیوطی ج ۲ ص ۳۵)

[2] یہ مسجد امیر ابو العباس احمد بن طولون نے ایک لاکھ بیس ہزار کی خطیر رقم سے تعمیر کرائی، اسکی تعمیر کی ابتداء ۲۶۳ھ اور تکمیل ۲۶۶ھ میں ہوئی خطیب کا بیان ہے کہ ایک دن مصر میں احمد بن طولون شکار کھیلنے گیا، اثنائے راہ میں ایک جگہ اسکے گھوڑے کے پاؤں ریت میں دھنس گئے، اسکے حکم پر جب وہ جگہ کھودی گئی، تو وہاں سے کروڑوں دینار کا دفینہ برآمد ہوا، امیر مذکور نے اس رقم کو صدقہ وخیرات میں صرف کیا اور ایک لاکھ بیس ہزار اس تاریخی مسجد کی تعمیر میں لگایا، سلطان لاجین نے شاہ اشرف کو قتل کرنے کے بعد اسی مسجد کے منارہ میں پناہ لی تھی، اسلیئے نئے سرے سے اسکی تجدید وتزئین کی اور اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور طب وغیرہ مختلف حلقہائے درس کا انتظام کیا جس سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے

[3] لحظ الالحاظ ص ۲۰۹

حواشی ص ہذا) [1] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ ـ ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۷۰

[2] الضوء اللامع ج ۷ ص ۸۰

وکان مع ذلک لایحب ان یدرس الابعد المطالعۃ[1]

اس تبحر علمی کے باوصف وہ بغیر مطالعہ کے درس دینا پسند نہیں کرتے تھے۔

تلامذہ ان کے علمی کمالات اور درس کی شہرت کی بناپر دور دراز ملکوں کے شائقین علم انکے حلقہ میں جمع ہوگئے، جن میں عام طلبہ کے علاوہ بڑے بڑے مفسرین، محدثین اور فقہا شامل تھے اور ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا،

ابن فہد کا بیان ہے کہ

رحل الیہ الطلبۃ من الآفاق الشاسعۃ للقراءۃ علیہ فانتفعوا بہ وتخرج بہ خلائق لا یحصون وخضع لہ الائمۃ من المفسرین والمحدثین والفقہاء والاصولیین والنحویین[2]

دور دراز ممالک کے طلبہ ان کسب فیض کے لیے سفر کرکے آتے، اور انکے حلقہ درس سے بے شمار طلبہ فارغ ہوئے اور اکابر مفسرین، فقہاء محدثین اصولیین اور نحویین نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔

مصر کے شافعی علماء وفضلا بالخصوص ماہرین فرائض کی اکثریت ان ہی کے فیضِ صحبت کی پروردہ ہے، حافظ ابن فہد ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

قرأعلیہ خلائق وانتفعوا بہ حتی ان اکثر الفضلاء بالدیار المصریۃ الآن من الفقہاء الشافعیۃ تلامذتہ او تلامذۃ تلامذتہ[3]

ان سے ایک بڑی جماعت نے استفادہ کیا یہاں تک کہ اس وقت مصر کے اکثر شافعی فقہا ان کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ تھے۔

[1] الضوء اللامع جلد ۷ ص ۸۰ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۱۱ [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۰۹

اور خود بلقینی کا بیان ہے کہ

ما احد یقرأ الفرائض الا — جو شخص بھی فرائض سے واقفیت رکھتا ہو وہ

وھو تلمیذی او تلمیذ تلمیذی[۱] — یا تو میرا شاگرد ہے یا میرے شاگرد کا شاگرد

لیکن ان کے بہت کم تلامذہ کے حالات ملتے ہیں، طبقات وتراجم کی کتابوں سے جو نام معلوم ہوسکے ان میں نمایاں اور لائق ذکر یہ ہیں :-

بدر الدین الزرکشی، ابن العماد، ابن جماعہ، ابن ناصر الدین، برماوی، ولی العراقی، برہان الدین الحلبی، جمال بن ظہیرۃ، زین الدین الفارسکوری، محب الدین بن نصر اللہ، ابن عماد، علامہ بن حجر عسقلانی، اقفہسی، تقی الدین الفاسی، الشمس الشنی، ان میں تنہا ابن ناصر الدین اور حافظ ابن حجر نے دنیائے علم وفضل میں جو نام پیدا کیا وہی شیخ بلقینی کی حیات جاوداں کے لیے کافی ہے، ان میں ابن ناصر الدین کو ان کے تبحر علمی کی بنا پر زبان خلق نے حافظ دمشق کے خطاب سے نوازا، اور ابن حجر کی شخصیت تاریخ اسلام کا زریں باب ہے، حافظ ابن حجر نے بلقینی سے اپنے تلمذ کا ذکر بڑے فخر ومباہات کے ساتھ کیا ہے، فرماتے ہیں :-

خرجت لہ اربعین حدیثاً — میں نے ان کے واسطہ سے چالیس شیوخ

عن اربعین شیخا حدث بھا — سے چالیس احادیث کی تخریج کی جنھیں

مراراً وقرأت علیہ دلائل — شیخ نے بار بار روایت کیا اور میں نے

النبوۃ للبیھقی نشھد لی بالحفظ — ان سے بیہقی کی دلائل النبوۃ پڑھی

فی المجلس العام وقرأت علیہ — چنانچہ شیخ نے میری قوتِ حافظہ کی شہادت

۱؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۹

ودرسا من الروضۃ و اذن لی[۱] — عام مجلس میں دی اور میں نے ان سے روضہ کے کچھ اسباق پڑھے، پھر شیخ نے مجھے سند اجازت بخشی

حدیث

یوں تو حافظ بلقینی جملہ اسلامی علوم وفنون کے جامع تھے، لیکن حدیث وفقہ انکے فکر ونظر کا اصل جولانگاہ، اور ان کی کلاہ افتخار کا طرہ امتیاز تھے، حدیث کی تحصیل میں انھوں نے بڑی محنت صرف کی تھی، رجال وانساب اور حدیث کے حفظ میں وہ وقت کے بلند مرتبہ شیوخ سے بھی فائق تھے، حدیث میں ان کے فضل وکمال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ انکے حلقۂ درس میں مذاہب اربعہ کے ممتاز علما، اور طالبان علم کا انبوہ عظیم جمع رہتا تھا خصوصاً احادیث احکام اور مذہب شافعی کی معرفت میں ان کی نظیر معاصر علما میں نہیں ملتی، اس حیثیت سے حافظ ابن حجر انکو اعجوبۂ عصر اور نادرۂ روزگار قرار دیتے ہیں،[۲]

شیخ برہان حلبی جنھیں حافظ بلقینی سے تلمذ کی سعادت حاصل ہے، بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث پر صبح سویرے سے ظہر کے قریب تک کلام کرتے رہتے، اور لبا اوقات نماز ظہر کی اذان بھی ہو جایا کرتی اور ان کی تقریر جاری رہتی[۳]

فقہ

حدیث کی طرح فقہ میں بھی انھیں پورا کمال حاصل تھا، اس فن میں انھوں نے دوسرے شیوخ کے علاوہ شمس الدین بن عدلان، عز بن جماعۃ، اور شمس الدین محمد بن القماح کے خرمن کمال سے خصوصی استفادہ کیا تھا،[۴] اور اپنے عہد میں فقہ بالخصوص فقہ شافعی کے سب بڑے حافظ شمار ہوتے تھے، قاضی صفد رقمطراز ہیں :

انتھت الیہ مشیخۃ الفقہ فی وقتہ[۵] — ان کے زمانہ کی فقہ کی امامت ان پر ختم تھی،

۱؎ شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۲ ۲؎ البدر الطالع ج ۱ ص ۵۱۱ ۳؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۰ ۴؎ ایضاً ص ۸۵ ۵؎ البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶

ان کی فقہی مہارت اور شہرت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہر مذہب ومسلک کے فضلاء ان کے حلقۂ درس میں شرکت کو باعثِ افتخار تصور کرتے تھے، حافظ ابن فہد لکھتے ہیں:

ممن کان یحضر عندہ الامام نور الدین ابن الجلال وکان افقہ اہل القاہرۃ یومئذ فی مذہب مالک[1]	ان کے حلقۂ درس میں جو لوگ حاضر ہوتے تھے ان میں امام نور الدین بن الجلال بھی تھے، جو اس وقت قاہرہ میں مذہب مالکی کے سب سے بڑے فقیہ تھے.

تقی الفاسی کا بیان ہے کہ وہ فقہ وحدیث میں بڑی وسیع اور گہری بصیرت رکھتے تھے[2]، محدث برہان الدین کا ارشاد ہے کہ میری آنکھوں نے فقہ اور احادیث احکام کا ان سے بڑا حافظ نہیں دیکھا[3]۔

افتاء فقہ میں مہارت کی بنا پر افتاء میں بھی بڑا کمال حاصل تھا، ان کے اساتذہ نے ۱۵ سال کی عمر میں انھیں فتویٰ دینے کی اجازت دیدی تھی، جو ایک منفرد مثال ہے، ابن عماد حنبلی رقمطراز ہیں:۔

اشتغل علی علماء عصرہ واذن لہ فی الفتیا وھو ابن خمس عشرۃ سنۃ[4]	انھوں نے علمائے عصر سے اکتسابِ علم کیا اور ۱۵ سال کی عمر میں انھیں فتوی دینے کی اجازت مل گئی،

پھر وقت کی رفتار کے ساتھ ان کی فقہی مہارت کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا، اور استفتاء کا انبار ان کے پاس آنے لگا، ابن فہد لکھتے ہیں:۔

دارت علیہ الفتوی بحیث انہا کانت تأتیہ من اقطار الارض البعیدۃ[5]	دور دراز ممالک سے ان کے پاس فتوی آنے لگے،

۱؎ لحظ الالحاظ ص ۲۱۶ ۲؎ شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۱ ۳؎ ایضاً ص ۵۱ ۴؎
۵؎ ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۱۱

ان کے خسر بہاء الدین عقیل کہا کرتے تھے کہ بلقینی اپنے زمانہ میں فتوی نویسی کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں[1]،

حافظ بلقینی کا معمول تھا کہ روزانہ نماز عصر کے بعد افتاء کے لیے بیٹھتے اور غروب آفتاب تک اس میں مصروف رہتے، بیشتر وہ اپنے حافظہ کی مدد سے قلم برداشتہ فتوی لکھتے تھے، لیکن کسی مسئلہ میں اشتباہ ہوجاتا تو کتابوں سے اس کی پوری تحقیق کرتے، اور جب تک ان کا قلب مطمئن نہ ہوجاتا، فتویٰ دینے سے احتراز کرتے، اور یہ ان کی احتیاط اور عالی ظرفی کی دلیل ہے کہ فقہی کتابوں کی طرف رجوع کرنے میں انھیں کوئی عار محسوس نہ ہوتا تھا،

حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ شیخ بلقینی کو افتا میں اس قدر مہارت اور کمال حاصل تھا کہ اکابر علمائے فن کی گردنیں ان کا نام سنکر خم ہوجاتی تھیں، علامہ اسنوی جیسے کہنہ مشق فقیہ بھی ان کی موجودگی میں حتی الامکان فتویٰ دینے سے محترز رہتے[2]،

عدل وقضا اس کمال تفقہ ہی نے انھیں عدل وقضا کی مسند تک پہنچایا اور وہ دمشق اور مصر میں مدتوں اس ذمہ داری کو انجام دیتے رہے، سب سے پہلے ۷۶۹ھ میں علامہ تاج الدین السبکی کی جگہ شام کے قاضی مامور ہوئے[3]، دمشق اس وقت ایک بڑا علمی مرکز تھا، اور وہاں علماء وفضلاء کی بڑی کثرت تھی لیکن حافظ بلقینی کے تفوق وبرتری پر سب متفق تھے، اور علمائے دمشق میں کسی نے بھی ان سے اختلاف رائے کی جرأت نہیں کی[4]، اس منصب پر وہ تقریباً ایک سال تک فائز رہے، اس کے بعد امیر طشتمر الدوادار نے انھیں مصر کی مسند قضا سپرد کی، جسے انھوں نے عرصہ تک انجام دیا، پھر اس سے سبکدوشی اختیار کرلی، اور ماہ صفر ۷۷۰ھ میں دمشق واپس آکر علمی مشاغل میں منہمک ہوگئے[5]، علامہ شوکانی نے مصر میں ان کے متعدد

۱؎ حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۰ ۲؎ لحظ الالحاظ ص ۲۱۱ ۳؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ ۴؎ شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۱
۵؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸ ۶؎ ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۱۰

بار قاضی ہونے کا ذکر کیا ہے، لیکن دوسرے تذکروں سے ایک مرتبہ سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا،

فضل وکمال کا اعتراف

ان کے عہد کے بڑے بڑے علما، ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، حافظ ابن حجر عسقلانی ان کی جلالت علمی کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ :۔

انہ افتی و درس وھو شاب و ناظر الاکابر وظھرت فضائلہ وبھرت فوائدہ وطار فی الآفاق صیتہ وانتھت الیہ الریاسۃ فی الفقہ[1]

انھوں نے عالم شباب ہی میں درس و افتاء کی خدمات انجام دیں اور اکابر سے مناظرہ کیا انکے فضائل و مناقب اسی وقت ظاہر ہو گئے تھے، اور انکی شہرت سارے عالم میں پھیل گئی تھی۔

حافظ بلقینی کے ایک شاگرد رشید اپنے ذاتی تجربات کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں،

ھو فی الفقہ وکذا فی الحدیث بحر وفی التفسیر ایضا[2]

وہ فقہ، حدیث اور تفسیر کا ایک سمندر تھے،

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں :

برع فی الفقہ والحدیث والاصول وانتھت الیہ ریاسۃ المذھب والافتاء[3]

وہ فقہ، حدیث اور اصول میں ماہر تھے، اور مذہب شافعی و افتا کی ریاست ان پر ختم تھی،

ذیل طبقات میں

ھو الامام العلامۃ شیخ الاسلام الحافظ الفقیہ البارع ذوالفنون المجتھد[4]

وہ امام، علامہ، شیخ الاسلام، حافظ، ماہر فقیہ اور مجتہد تھے،

۱؎ الضوء اللامع ج ۲ ص ۸۸ ۲؎ ایضاً ۳؎ حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ ۴؎ ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۶۹

جیسے القاب سے ان کا ذکر کیا گیا ہے،

حافظ ابن فہد مکی نے انکے علم و فضل کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

ھو اعجوبۃ الدھر خاتمۃ المجتھدین شیخ وقتہ وحجتہ وامامہ و ...... نادرتہ فقیہ الزمان بالاتفاق شیخ الاسلام علی الاطلاق اعلم اھل عصرہ بجمیع العلوم وادراھم بالمفھوم والمنطوق مفتی الانام ملاذ العلماء الاعلام عون الاسلام والمسلمین وحجۃ اللہ تعالیٰ علی خلقہ اجمعین[1]

وہ اعجوبۂ روزگار، خاتمہ مجتہدین ..... شیخ وقت، حجت عصر، امام دوراں، نادرۂ زمن اور بالاتفاق فقیہ عہد تھے، اپنے زمانہ میں تمام علوم کے سب سے بڑے عالم اور عقلی و نقلی امور کے سب سے بڑے واقفکار تھے، اسی طرح وہ مفتی خلائق، سلطان علم و علماء، مسلمانوں و اسلام کی حامی اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق پر حجت و برہان تھے،

قوت حفظ و استحضار

مبدأ فیاض نے انھیں قوتِ حفظ، کثرتِ استحضار اور سرعتِ ادراک سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا، ابن عماد لکھتے ہیں :۔

وکان اعجوبۃ زمانہ حفظاً واستحضاراً ...... واعترفت لہ علماء جمیع الاقطار بالحفظ و کثرۃ الاستحضار[2]

وہ اپنے زمانہ میں حفظ و استحضار کے اعتبار سے ایک عجیب و غریب شخص تھے ..... پوری دنیا کے علماء نے انکی قوت حافظہ اور کثرت استحضار کا اعتراف کیا ہے۔

ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ کے واقعات کتابوں میں مذکور ہیں، ۷۳۶ھ میں جب وہ اپنے والد کے ہمراہ مصر آئے تو ان کی ۔۔۔۔ کل بارہ سال کی تھی، اس کم عمری میں انھوں نے

۱؎ لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ ۲؎ شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

مصر کے ممتاز علماء کے سامنے جب اپنے معلومات زبانی پیش کیے تو وہ ان کی ذہانت و فطانت اور سرعت ادراک کو دیکھ کر ششدر رہ گئے[۱]، اسی طرح ۷۳۸ھ میں جب دوبارہ قاہرہ آئے اور مدرسہ کاملیہ میں مقیم ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد مدرسہ کے نگراں سے ایک مکان کی درخواست کی۔ اس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اسی اثناء میں ایک شاعر آیا اور اس نے شیخ کی موجودگی میں ایک قصیدہ سنایا، شاعر کے چلے جانے کے بعد حافظ بلقینی نے ناظر کاملیہ سے فرمایا کہ میں یہ قصیدہ زبانی سنا سکتا ہوں، ناظر نے کہا اگر آپ سنا دیجئے تو میں آپ کے لیے مکان کا انتظام کر دوں گا۔ حافظ بلقینی نے اسی وقت پورا قصیدہ سنا دیا۔ اس کو سنکر ناظر نے باب المیضاۃ کی بالائی منزل میں انکو ایک مکان دیدیا[۲]

علامہ ابن حجر کا بیان ہے:-

کان احفظ الناس لمذہب	وہ مذہب شافعی کے سب سے بڑے حافظ
الشافعی واشتہر بذلک	تھے، اپنے شیوخ کی موجودگی ہی میں
وطبقۃ شیوخہ موجودون	ان کو اس حیثیت سے شہرت حاصل ہوگئی
قدم علینا دمشق قاضیاً	جس وقت وہ ہمارے پاس دمشق آئے
وھو کھل فبھر الناس	کافی بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن اس
بحفظہ وحسن عبارتہ	وقت بھی انھوں نے اپنی قوت حافظہ،
وقوۃ معرفتہ[۳]	حسن عبارت اور قوت معرفت سے
	لوگوں کو متحیر کر دیا۔

حافظ برہان الدین کہتے ہیں:-

۱؎ لحظ الالحاظ ص ۲۰۶ ۲؎ البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶ ۳؎ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۶

کان فیہ من قوت الحافظہ	قوت حافظہ اور شدت ذکاوت
وشدۃ الذکاء مالم یشاھد	میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔
فی مثلہ[۱]	

شیخ ابن الجبل نے ایک بار خود حافظ بلقینی سے کہا

مارأیت بعد ابن تیمیۃ	میں نے ابن تیمیہ کے بعد تم سے بڑا
احفظ منک[۲]	حافظ نہیں دیکھا۔

(باقی)

۱؎ لحظ الالحاظ ص ۱۲ ۲؎ البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶

بانی درسِ نظامی مُلّا نظام الدین محمد فرنگی محلیؒ

جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی استاد دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

(۹)

استاذ الہند ملا نظام الدین محمد کی فروتنی، خاکساری، عاجزی اور بردباری کے نمونے واقعات اور خود ملا صاحب کی نجی تحریروں کے ضمن میں اوپر گذرے، بظاہر ان کا بنیادی سبب تو وہ ہولناک واردات ہے جس سے ملا صاحب نوعمری ہی میں دوچار ہوئے تھے، ۱۴ سال کی عمر میں آنکھوں کے سامنے نامور والد ماجد کی شہادت، گھر کی تاراجی اور خود اپنی اسیری وہ زبردست سانحے تھے جنھوں نے ملا صاحب کو تمام عمر کے لیے رقیق القلب اور حلیم بنا دیا تاریخ اسلام میں اس کی نظیر امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی سیرت میں نظر آتی ہے، جن کی نظروں میں پورا حادثۂ فاجعہ کربلا، اس طرح بسا رہا کہ تمام عمر کسی نے ان کو شاداں نہیں دیکھا، ملا نظام الدین پر جو کچھ گذرا، اس کا بھی فطری تقاضا یہی تھا کہ ان کا قلب رقیق و گداز ہو، اور ان کے مزاج میں عجز و انکسار کا پورا پورا دخل ہو جائے، تاہم ملا صاحب کے اس مخصوص مزاج کے استحکام اور درجۂ کمال تک پہنچنے میں اس رشتے کا بھی بہت بڑا ہاتھ نظر آتا ہے، جو ان کے پیر طریقت حضرت سید شاہ عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۳۶ھ) سے غلامی اور نیازمندی کا تھا۔

استاذ الہند کے سوانح حیات کا یہ پہلو، عقیدت اور ارادت کی تاریخ کا انتہائی روشن باب ہے، وہ جس کے علم و فضل کے آگے بڑے بڑوں کی گردنیں خم نہیں ہوتی تھیں، وہ جس کا

جاری کردہ نصاب تعلیم — درس نظامی — اکیلے اپنے عہد ہی میں نہیں، عہد بعد تک علم و فضل کا اعلیٰ معیار بنا رہا اور وہ جس کی معقولات کی ہمہ گیری اوج کمال تک پہنچی ہوئی تھی، ایک اَن پڑھ اور امی محض کے آستانے پر جبین عقیدت رکھے نظر آئے، تو تاریخ کا طالب علم، اس جگہ حیرت کے ساتھ کھڑا اس نادر الوقوع واقعے کے اسباب و علل پر پوری توجہ صرف کرتا نظر آئے گا، بلاشبہ اس بظاہر عجیب واقعہ میں استاذ الہند کی سیرت اتنی زیادہ معرض بحث میں نہیں آئے گی جتنی اس مرشد اور پیر طریقت کے علوِ مرتبت کی تحقیق اور تفتیش جس نے منطق و فلسفہ کے امام الوقت کو اپنی تربیت و ارشاد کا محتاج بنا کر رکھ دیا، اور چونکہ اس علوِ مرتبت کا ادراک ہر کس و ناکس کے اختیار سے باہر ہے اس لیے جو اس میدان کا نہیں ہے وہ حیرت میں مبتلا رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا کہ اتنا بڑا فاضل ایک اَن پڑھ پیر طریقت کا اس درجہ عقیدت مند!

یہ حیرت ذہنوں میں صرف ایک خلش بن کر نہیں رہ سکتی تھی اور نہیں رہی، دوسرے نہیں، خود گھر والے، ملا صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی ملا محمد رضا، حیرت ہی نہیں بلکہ خاصی ناراضگی کے ساتھ کہتے تھے:

عجب است از تو، کہ با ایں علم و وقار — آپ پر تعجب ہے کہ اس علم و عزت کے باوجود
بیعت فقیر جاہل ناخواندہ کردہ و عزت — ایک ناخواندہ جاہل فقیر کی بیعت کر لی
خاندان خود را نگاہ نداشتی؟ — اور خاندان کی عزت کا بھی کوئی پاس نہیں کیا۔

حلیم الطبع بڑے بھائی، چھوٹے بھائی کے اس طنز پر غصہ نہیں ہوتے، صرف اتنا کہہ دیتے تھے:

محمد رضا! ایں کیفیتے است کہ ادراکش — محمد رضا! جس معاملے پر تم اعتراض کر رہے ہو
بے حصولش ممکن نیست، اگر بیان و تقریر — وہ ایک ایسی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے جس کا

ممکن بودے ترا فہمانیدم

اور اگر بغیر اس کیفیت کے حصول کے
ممکن نہیں ہے۔ اگر الفاظ و بیان کے ذریعہ
اس کا سمجھنا ممکن ہوتا تو میں تمہاری تشفی
ضرور کر دیتا۔

دیکھنے کی بات ہے کہ وہ جو افلاطون و ارسطو، بوعلی سینا و فارابی، رازی و طوسی کے پیچیدہ خیالات اور باریک نظریات سے شب و روز کھیلنے کا عادی تھا، وہ اس "لطیف کیفیت" کے شرح و بیان سے اس درجہ اپنے کو عاجز ظاہر کرے، سچ ہے:۔

تمکین درس اہل نظر یک اشارت است
کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

استعجاب اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ ملا نظام الدین نے "پیر طریقت" کا انتخاب خود کیا تھا، یہ نہ تھا کہ خاندانی طور پر وہ اس سلسلۂ بیعت سے وابستہ چلے آئے ہوں، اور انھوں نے محض اس رشتہ کی تجدید کر کے خاندانی روایت کی تعمیل کر لی ہو، ایسا ہوتا تو چنداں تعجب نہ تھا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ ملا صاحب کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی، حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی کے جانشین اور خلیفہ قاضی گھانسی کے۔ جن کا پورا نام قاضی [illegible] تھا۔ مرید اور خلیفہ تھے۔ اور ملا قطب الدین شہید کے دونوں بڑے صاحبزادے ملا محمد اسعد اور ملا محمد سعید، جیسا کہ تذکروں میں ضمنی طور پر ملتا ہے، اپنے والد ماجد کے مرید ہوئے تھے اور ان سے خلافت بھی پائی تھی، سنجھلے صاحبزادے ملا نظام الدین محمد کے لیے بظاہر ان کے لیے بھی یہی راہ کھلی ہوئی تھی کہ وہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں جو ان کے والد ماجد کا سلسلہ تھا، داخل ہو جاتے، لیکن انھوں نے اپنے پیر طریقت کو خود ہی پایا اور ایسا پیر پایا جو عام نگاہوں میں ان پڑھ اور امی تھا، لیکن علم و فضل کی نکتہ شناس نظر میں وہ اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ

علم و فضل کو اس کے قدموں پر نثار کر دینا بھی نفع کا سودا نظر آیا۔ پھر بھی یہ پہلو تحقیق طلب رہ جاتا ہے کہ وہ ظاہری اسباب کیا تھے جنھوں نے ایک عالم فاضل کو ایک امی بزرگ کے آستانے تک پہنچا دیا۔

خواب و خیال کی باتیں عام تاریخ میں خواہ کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں، لیکن عقیدت و ارادت کی تاریخ میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اسی لیے رویائے صادقہ کو منجملہ اقسام وحی قرار دیا گیا ہے، بہت زیادہ قدیم روایت تو اس سلسلے میں کوئی نہیں ملی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی متوفی ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۶ء) نے اپنے بزرگوں سے سلسلہ بسلسلہ سنکر ایک ذکر کیا ہے:۔

"ملا نظام الدین اور ان کے بھتیجے اور شاگرد ملا احمد عبد الحق بن ملا محمد سعید نے ایک ہی رات میں خواب دیکھا کہ حضرت غوث پاک کے دربار میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بھی ہیں، اور غوث پاک فرما رہے ہیں کہ ان دونوں کو (ملا نظام الدین اور ملا احمد عبد الحق کو) ہمیں دیدو، خواجہ صاحبؒ نے دونوں کو ہاتھ پکڑ کر حاضر کر دیا حضرت غوث پاک نے دونوں کو ایک صاحب کے حوالہ کر دیا، یہ صاحب جو پس پشت کھڑے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ میں (ہاتھ) پکڑا دیے، ان کی صورت ان دونوں نے دیکھی اور خوب یاد کر لی، صبح کو دونوں نے ایک دوسرے سے اپنا خواب بیان کیا، جو بالکل یکساں تھا، ملا نظام الدین نے فرمایا کہ غالباً ہماری تمہاری قسمت میں ان ہی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کرنا ہے۔" (فیوض حضرت بانسہ مطبوعہ)

جن صاحب کے ہاتھ میں ان دونوں کے ہاتھ دیے گئے تھے، ان سے بیداری میں ملاقات کب ہوئی اور کہاں ہوئی، اس سوال کا بھی جواب تذکروں میں صراحت کے ساتھ

نہیں ملتا ہے، یہاں تک کہ خود ملا صاحب نے اپنے مرشد کے حالات میں جو رسالہ تحریر فرمایا ہے
اور جو اس وقت ہماری دست درس میں بھی ہے، وہ بھی اس سوال کے جواب سے خالی ہے،
اس جگہ بھی مولانا عبد الباری فرنگی محلی (متوفی ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء) کی سماعی روایت کا ذکر
کرنا پڑ رہا ہے، جو واقعہ کے دو سو برس کے بعد قلم بند ہوئی، لیکن اس تاخر زمانی سے
یہ لازم نہیں آتا کہ روایت مستند نہیں رہی، یا ضعیف ہو گئی، اس لیے لازم نہیں آتا کہ
ملا صاحب کا ایک امی بزرگ کے ہاتھ پر مرید ہو جانا ایسا واقعہ تھا کہ ہر زمانے میں خاندان
کے لوگوں میں اس نادر الوقوع معاملے کا ذکر ہوتے رہنا ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی تھا،

حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی تحریر فرماتے ہیں:-

"مجھے اپنی سماعت سے یاد پڑتا ہے کہ اکثر اکابر سے یوں سنا ہے کہ اس کرامت
کے ہم معنی ذکر حضرت ملا نظام الدین کے درس میں بھی ہوا، ملا صاحب کے طلبا شاہ
پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر رہتے تھے، باہم بحث کرنے لگے کہ ملا صاحب نے دلائل عقلیہ
سے ہم کو ساکت تو کر دیا مگر یہ بات ناممکن ہے، حضرت (سید شاہ عبد الرزاق بانسوی)
تشریف لائے یا پہلے سے بیٹھے تھے، آپ نے فرمایا "کیا بحث کر رہے ہو؟" ایک طالب علم
نے کہا "تم کیا جانو جاہل سپاہی! یہ علمی بحث ہے"، آپ نے فرمایا "علما کی باتوں سے جاہل
فائدہ اٹھاتے ہیں"۔ غرضکہ ایک طالب علم نے بحث کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا "تم لوگ
معقولی ہو، جانتے ہو بعد وقوع کے امکان سے بحث نہیں ہوتی، اگر تم اس امر کو
واقع ہی دیکھ لو تو پھر تم کو قبول کرنے میں عذر نہ ہوگا"۔

اس کے بعد طلبہ نے کرامت کا مشاہدہ کر لیا، حضرت سید صاحب پر اس وقت جلال
طاری تھا، مصنف "فیوض حضرت بانسہ" کے الفاظ ہیں:-

"آپ نے فرمایا، جناب رسالت مآب بڑے مرتبے کے ہیں، ان کے خادموں کی
یہ نورانیت ہے کہ جس کثیف جسم سے مس کر جائیں اس کو نورانی کر دیتے ہیں، چنانچہ
اسی حالت غیظ میں کہا "یہ مسجد ہے اس کے ستون سے مجھکو باندھو، وہ خشتی ستون
(جو اب تک ہے) حضرت کی کمر میں باندھا گیا اور چادر اسی طرح نکل آئی"۔

خشتی ستون جس کا ذکر مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، انکی
تحریر کے وقت تک گویا آج سے پچاس سال قبل تک موجود ہوگا، مگر اب نئی تعمیر میں جو اس کے
بعد ہوتی رہی، باقی نہیں رہا، لکڑی کے ستون کے بجائے سمنٹ اور اینٹوں کے کھمبے بنگئے ہیں،

بہرحال مولانا عبد الباری صاحبؒ اس کے آگے تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ قصہ (صدور کرامت کا واقعہ جو ملا نظام الدین کے شاگردوں کے سامنے شاہ
پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر پیش آیا تھا) حضرت ملا نظام الدین نے سنا اور حلیہ حضرت کا
دریافت کیا، تو وہ خواب جو انھوں نے دیکھا تھا کہ حضرت غوث اعظمؓ نے ان کو حضرت
خواجہ بزرگ سے مانگ کر ایک بزرگ کے ہاتھ میں ان کا ہاتھ دیدیا تھا، یاد آیا، حلیہ مطابق
ان بزرگ کے حلیہ کے پایا، یہی امر حضرت ملا نظام الدین اور حضرت ملا احمد عبد الحق
(فرنگی محلی) قدس سرہما کے داخل سلسلہ ہونے کا ہوا"۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے بچشم خود کرامت کا مشاہدہ نہیں کیا، بلکہ ان کے طلبا
نے جو شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر رہتے تھے، صدور کرامت کا واقعہ بیان کیا تھا، ملا صاحب
نے ان بزرگ کا حلیہ دریافت کیا جن سے کرامت صادر ہوئی تھی، طلبہ نے جو حلیہ بتایا وہ
بالکل وہی تھا جو خواب میں دکھائے گئے بزرگ کا تھا، اب کوئی وجہ تاخیر کی نہ تھی، ملا صاحب
اور ان کے بھتیجے اسی جگہ پہنچے جہاں ان بزرگ کے قیام فرما ہونے کا گمان تھا، اور ملاقات

کے بعد تصدیق بھی کر لی کہ بعینہ وہی بزرگ ہیں جن کی زیارت خواب میں ہوئی تھی، دونوں حضرات ان کے مرید ہو گئے۔

مگر یہ کرامت کیا تھی؟ جسم نورانی سے کپڑے کا جو جسم پر بندھا ہوا ہے، بغیر کھولے آر پار نکل جانا! اس کرامت کا ذکر خود ملا صاحب نے اپنے مرشد کے ذکر پر مشتمل رسالہ "مناقب رزاقیہ" میں کیا ہے، لیکن یہ نہیں لکھا ہے کہ یہی کرامت ان کے مرید ہونے کا باعث ہوئی۔ ملا صاحب نے کرامت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

در مجلس بعض علماء حرف خرق عوائد درمیان	بعض علماء کی محفل میں معجزے کی بحث
شد، وے استعجاب کرامتے کہ حضرت	ہو رہی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ
سیدۃ النساء فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ	وسلم کے اس معجزے پر جو حضرت بی بی
عنہا از پیغمبر خدا صلوات اللہ تعالیٰ	فاطمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ
علیہ وآلہ دیدہ کہ ردائے مبارک از	آپ کی ردائے مبارک اگر آگے یا پیچھے
پس یا پیش می کشیدند اندام مبارک حائل	کھینچی جاتی تو آپ کا جسم مبارک حائل
نمی شد بے تکلف از طرفے بطرفے می آمد	نہ ہوتا اور بے تکلف ردائے مبارک
حضرت شیخ قدس سرہ الاصفیٰ گفت:	ادھر سے ادھر نکل آتی تھی، اس محفل
حالا ہم بفیض رسول خدا صلوات اللہ	علماء میں لوگ انکار کے انداز میں اظہار
تعالیٰ علیہ وعلی آلہ الطاہرین از امتائے	تعجب کر رہے تھے، حضرت سید صاحب
وے کہ خلفائے باطن باشند می توانند شد	بانسوی نے فرمایا: حضور انور صلوات اللہ
پس گفت: چادرے را بکشید کشیدند میان	تعالیٰ علیہ وعلی آلہ کے فیضان سے آپ
خود یافتند سر ہر دو طرف چادر را	کی امت کے امین جو باطنی خلفاء آپ کے ہیں

گرفتہ کشیدند اندام مبارک حائل	یہی کر سکتے ہیں، پھر حضرت سید صاحب نے
نشد (مناقب رزاقیہ مطبوعہ)	فرمایا: میری چادر کھینچو، حضار محفل نے
	حسب الحکم چادر کھینچی اور وہی بات پائی
	کہ چادر کے دونوں سروں کو پکڑ کر
	گھسیٹ لیا اور وہ کھنچ آئی جسم مبارک
	مانع نہیں ہوا۔

"مجلس بعض علماء" کی کوئی وضاحت ملا صاحب نے نہیں فرمائی اور یہ بھی تحریر نہیں فرمایا کہ اس کرامت کا صدور کہاں ہوا، صاحب عمدۃ الوسائل للنجاۃ ملا ولی اللہ فرنگی محلی (متوفی ۱۲۷۰ھ) نے جنھوں نے ملا صاحب کی تصنیف "مناقب رزاقیہ" کو از سر نو ترتیب دے کر اور معتدبہ اضافوں کے ساتھ مکمل کیا اور اس کا نام "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" رکھا، اس کرامت کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس تفصیل کے بیان کے بعد جو ملا صاحب نے تحریر فرمائی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی لکھتے ہیں:-

تا آنکہ بعضے از آنہا از سر انکار در گزشتہ	محفل علماء میں معجزے پر بحث کے دوران
قریب بکفر رسیدند و بعضے در عالم شک	بعض تو بالکل انکار تک پہنچ گئے اور کفر
و تذبذب در افتادند حضرت قدس سرہ	کے قریب ہو گئے، بعضے شک اور تردد میں
مامور شدند کہ آنہا را از ورطہ	جا پڑے، حضرت سید صاحب کو غیبی حکم ہوا کہ
وازیں ورطہ نجات بخش در حال دراں	جلد ان لوگوں تک پہنچو اور انھیں گمراہی
مجلس رسید و گوید کہ آں زماں در	کے بھنور سے نجات دلاؤ، فوراً حضرت
عالم نوکری بود ہنوز بجا نہ نشستہ	سید صاحب علماء کی محفل میں پہنچے، کہتے ہیں کہ وہ

سلام گزارد و به اہل محفل وگفت .....

دو، تھا جب حضرت سید صاحب نوکری
(سپاہیوں میں ملازمت) کرتے تھے اور
سپاہیوں ہی کی وضع اور لباس میں رہتے
تھے) آپ نے وہاں پہنچتے ہی حاضرین محفل کو
سلام کیا اور ان سے فرمایا .....

حضار مجلس سے حضرت سید صاحب نے وہی فرمایا جس کا ذکر ملا نظام الدین نے "مناقب رزاقیہ" میں کیا ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی نے اس کے بعد مزید لکھا ہے کہ حضار محفل نے حضرت سید صاحب کے ارشاد کو درخور اعتنا نہ سمجھا بلکہ آپ کا دخل انھیں ناگوار ہوا، خاموش رہنے کی ہدایت کر کے وہ پھر بحث و تکرار میں لگ گئے، دوبارہ حضرت سید صاحب نے انھیں یہ کہکر اپنی طرف متوجہ فرمایا کہ

جائے شک چیست ایں قدرت بر
آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات
ختم نگردیدہ از دست اولیائے
امت او ہم ممکن است

آنحضرت کے اس معجزے میں شک کی
کیا وجہ ہے؟ جسم نورانی سے روئے مبارک
کا بند سے بندھے نکل آنے کا معجزہ آنحضرت
پر ختم نہیں ہو گیا ہے، آپ کی امت کے اولیاء سے
بھی اس کا بطور کرامت صدور ممکن ہے۔

حاضرین محفل نے مطالبہ کیا کہ "اگر تم سے اس کا صدور ممکن ہو تو دکھاؤ، شک آپ ہی رفع ہو جائے گا"۔ ملا ولی اللہ لکھتے ہیں :-

دریں حالت بر آنحضرت طاری شد کہ
از خود در گزشت و ظہور جلال ربانی

اسی وقت حضرت سید صاحب پر ایک
ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ وہ آپ میں

رو نمود

نہیں معلوم ہوتے تھے، جلال ربانی
کا پوری طرح ظہور آپ سے ہو رہا تھا،

پھر اسی طرح ہوا جیسا کہ ملا صاحب نے صدور کرامت کے سلسلے میں مناقب رزاقیہ میں تحریر فرمایا ہے،

ملا نظام الدین کی "مناقب رزاقیہ" غالباً اولین کتاب ہے جو حضرت سید عبد الرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ مستند ترین بھی ہے، نہ صرف اس لیے کہ مصنف کا مرتبۂ علمی بدرجہا بلند ہے بلکہ اس لیے بھی کہ یہی وہ کتاب ہے جو دیکھنے والے کی لکھی ہوئی ہم تک پہنچ پائی ہے، ملا ولی اللہ فرنگی محلی کے بیان کے مطابق ملا صاحب کی یہ تصنیف کامل اور جامع نہیں ہے۔ وہ اپنی تصنیف "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" کا سبب تالیف بیان کرنے کے ضمن میں لکھتے ہیں :-

تا آنکہ بہ خاطر گذشت کہ رسالہ مناقب
رزاقیہ کہ آں را عارف کامل رئیس
عالمان مقتدائے زماں قطب الاقطاب
مولانا نظام الملۃ والدین السہالوی
قدس سرہ تالیف فرمودہ و از اتفاقات
تصحیح و تہذیبش میسر نگشتہ و تحریف
کاتباں علاوہ براں ازیں جہت
عبارتش از نظم و نسق فارسی در گزشتہ
بہ مقصود خود و مسائی جمیلہ بکار بردم و

یہاں تک کہ اچانک خیال ہوا کہ عارف
کامل رئیس علما مقتدائے زماں قطب
الاقطاب مولانا نظام الدین سہالوی
(ثم فرنگی محلی) قدس سرہ کے تالیف کردہ
رسالۂ مناقب رزاقیہ کو جس کی تصحیح
و ترتیب کا موقع مصنف کو نہیں مل سکا
تھا اور نقل کرنے والوں کی تحریف نے
اس کی عبارت کو اور مسخ کر کے فارسی
اسلوب تک سے ہٹا دیا ہے حتی المقدور

حالانکہ آنحضرت جمع کردہ بطرتی تہذیب
بعبارت فارسی سلیس قریب الفہم
ہر عامی وخاصی ترقیم نمائیم ولکن
دریں امر خطیر جرأت کردن نمی
توانستم ......

درست کیا جائے اور ملا صاحب نے اپنے رسالے
میں جو حالات جمع کر دیے ہیں ان کو سلیس
فارسی میں ایسی ترکیب کے ساتھ پیش کیا جائے
کہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھا سکے لیکن
اس بار عظیم کے اٹھانے کی ہمت نہیں ہو پائی تھی...

ملا نظام الدین کا تالیف کردہ تذکرہ "مناقب رزاقیہ" جامع و کامل نہ ہونے نیز نظرِ ثانی سے محروم ہونے کے باوجود ایک ماہر مصنف اور ایک مستند عالم دین کی تصنیف ہے، اور ایسی تصنیف ہے جو عقیدت و ارادت کے بے محابا اظہار پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی افراط و تفریط سے یکسر مصئون و محفوظ ہے، عقیدت مند مصنف کا قلم نشۂ ارادت میں سرشار ہونے کے باوصف جادۂ اعتدال سے سرمو انحراف نہیں کرتا، کرامات و الہامات کے ذکرِ فراواں کے دوران بھی احادیث و اقوال فقہا سے سندیں اور تائیدیں پیش کرتا جاتا ہے۔

ملا صاحب کی مناقب رزاقیہ میں وہ تنہا کتاب ہے جسے حضرت سید صاحب بانسویؒ کی معاصر تاریخ سے یاد کیا جا سکتا ہے، ہو سکتا ہے اور بھی معاصر تاریخیں اور سوانح حیات ہوں مگر ہم تک وہ پہنچ نہیں سکیں۔ ملا صاحب کے شاگرد رشید ملا کمال الدین سہالوی (متوفی ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) نے بھی اپنے مرشد حضرت سید صاحب بانسویؒ کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا سراغ اب کہیں نہیں ملتا ہے، رضی الدین محمود انصاری فتحپوری (متوفی ۱۲۶۰ھ) کی تصنیف "اغصان الانساب" (مخطوطہ) میں بس اس کا حوالہ ملتا ہے

سلطان العلماء، ملا نظام الملۃ والدین
محمد قدس سرہ و ملک العلماء ملا کمال الملۃ

ملا نظام الدین محمد قدس سرہ اور ملا کمال الدین
محمد قدس سرہ نے سید عالی نسب حضرت

والدین محمد قدس سرہ درباب خرق عادات
آں سید عالی نسب علیہ الرحمہ رسالہا
پرداختہ مسمی مناقب رزاقیہ گردانیدہ اند
من بے مایہ تہیدست را چہ یارا کہ
لب بر مدح آں سید والاحسب بکشایم

سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ) کی
کرامتوں کے بیان میں رسالے تصنیف
کیے ہیں اور ان کے نام "مناقب رزاقیہ"
رکھے ہیں، میرے ایسے بے مایہ اور تہی دست
کی مجال کہاں کہ سید والاحسب کی مدح
وثنا میں لب کشائی کروں۔

ملا کمال الدین کی تصنیف کردہ "مناقب رزاقیہ" ہمارے لیے معدوم ہو چکی ہے، بہرحال ملا نظام الدین کی "مناقب رزاقیہ" موجود ہے، اور کئی بار طبع ہو چکی ہے، اعتبار اور استناد میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے، اس کے بعد مستند اور معتبر ہونے میں ملا ولی اللہ فرنگی محلی کی کتاب "عمدۃ الوسائل للنجاۃ" کا درجہ ہے، ملا ولی اللہ نے اپنی تصنیف حضرت سید صاحب بانسویؒ کے وصال پر پچھتر سال گزرنے سے قبل ہی مرتب کر لی تھی، تعجب نہ ہونا چاہیے اگر عمدۃ الوسائل کے مصنف نے صدور کرامت کی تفصیل دیکھنے والوں سے یا دیکھنے والوں سے براہ راست سننے والوں سے سن کر اپنی کتاب میں درج کی ہو۔

پھر بھی "محفل علما" کی تفصیل و وضاحت نہیں ہو پائی، یہ وضاحت "ملفوظ رزاقی" اور "کرامات رزاقیہ" کے مصنف نواب محمد خاں رزاقی شاہجہانپوری نے کی ہے، نواب صاحب نے اپنی تصانیف میں تمام واقعات اپنے ان بزرگوں سے جن کو حضرت سید صاحبؒ کے سلسلے سے قدیمی تعلق تھا، اور اپنے مرشد زادوں سے سنکر درج کیے ہیں، نواب صاحب کے پیر و مرشد حضرت شاہ غلام علی بانسویؒ (متوفی ۱۲۲۲ھ) تھے، جو حضرت سید صاحب بانسوی کے فرزند کے فرزند تھے، ملفوظ رزاقی کا بیان ہے:-

روزے آنحضرت قدس سرہٗ در قصبۂ
سوہان تشریف می داشت برجوئے کہ
بسی نام دارد بقتضائے حاجت رفتہ
وضو می کرد ملہم شد کہ شخصے طالب علم
باستاد خود از معجزۂ سرور کائنات
علیہ افضل الصلوات والتسلیمات
بدلائل عقلی انکار می نماید و قریب
است کہ ایمانش زائل گردد تو برو
وایمانش ثابت و قائم دار آنحضرت
قدس سرہ الاصفی بموجب امر حق
جل وعلی بمکان مولوی ابو الفتح
در قصبۂ نیوتنی از سوہان قریب است
ظاہر المباس سپاہیانہ قبضۂ شمشیر
حمائل و چند تیر و کمان در دست
بر اسپ سوار رسید .....

ایک روز حضرت سید صاحب بانسوی
قصبۂ سوہان میں تشریف رکھتے تھے۔
بسی ندی پر حوائج ضروریہ سے فارغ
ہو کر وضو فرما رہے تھے کہ الہام ہوا
ایک طالب علم اپنے استاد سے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزے سے
عقلی دلائل کی بنا پر انکار کر رہا ہے،
قریب ہے کہ اس کا ایمان زائل ہو جائے،
فوراً پہنچو اور اس کے ایمان کو قائم اور
سلامت رکھنے کی تدبیر کرو حضرت سید صاحب
حکم خداوندی کے بموجب مولوی ابو الفتح
کے مکان پر قصبۂ نیوتنی (جو قصبہ سوہان
سے قریب ہی ہے) سپاہیانہ وضع میں تلوار
حمائل کیے چند تیر اور کمان ہاتھ میں اٹھائے
گھوڑے پر سوار تشریف لے گئے.....

اس کے بعد ملفوظ رزاقی کے مصنف نے صدور کرامت کا واقعہ اسی طرح لکھا ہے جس طرح مناقب رزاقیہ اور عمدۃ الوسائل میں ہے، ملفوظ کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوا کہ مولوی ابو الفتح کی محفل تھی، جسے "در محفل علماء" کے الفاظ سے استاذ الہند ملا نظام الدین نے مناقب رزاقیہ میں ذکر کیا ہے، مناقب رزاقیہ کے ایک محشی میاں سید شاہ غلام جیلانی بانسوی کے الفاظ میں

"جناب الاشیخ ابو الفتح عثمانی حنفی چشتی نیوتنوی مرید جناب شاہ پیر محمد لکھنوی" ہیں۔
ملفوظ رزاقی کے بیان کے مطابق صدور کرامت نیوتنی ضلع اناؤ (یوپی) میں ہوا عجب نہیں کہ اس واقعہ کی شہرت لکھنؤ تک پہنچی ہو جو نیوتنی سے بتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے، اور قیاساً یہ کہا جاسکتا ہے، ایسی نادر الوقوع کرامت کا ذکر جو دلائل عقلیہ کی رو سے قابل قبول نہیں ہو سکتا، استاذ الہند ملا نظام الدین کے ایسے معقولی اور فلسفی کے درس میں طلبہ نے بطور استعجاب کیا ہو اور ملا صاحب نے ایسے خوارق عادت امور کے صدور کو عقلی دلائل سے ثابت کر دیا ہو، طلبہ ملا صاحب کے دلائل سے ساکت ہو گئے ہوں، مگر مطمئن نہ ہوئے ہوں، اور اسی بے اطمینانی کا اظہار اپنی قیام گاہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر کر رہے ہوں کہ حضرت سید صاحب بانسویؒ وہاں پہنچ گئے یا پہلے سے موجود تھے، اور انھوں نے طلبہ کو کرامت کا مشاہدہ کرادیا، دوسرے دن طلبہ نے درس میں اس کا ذکر کیا اور رات کا واقعہ بیان کیا۔ ملا صاحب ان بزرگ کا حلیہ وغیرہ دریافت کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مرید ہو گئے،

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ملا نظام الدین چالیس سال کی عمر میں حضرت سید صاحبؒ بانسوی کے مرید ہوئے، اس بنیاد پر ملا صاحب ۱۱۳۰ھ میں مرید ہوئے، کیونکہ انکی پیدائش کا تخمینی سال ۱۰۹۰ھ ہے، تذکرہ نویسوں کا یہ اندازہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ ملا نظام الدین کے استاد ملا غلام نقشبند کی حیات میں یہ واقعہ پیش آچکا تھا، اور ملا غلام نقشبند کا انتقال ۱۱۲۶ھ میں ہوا ہے، ملفوظ رزاقی کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت سید صاحب بانسویؒ کی اس کرامت کا جب شہرہ ہوا تو علوم عقلیہ کے ماہرین و طالبین نے ملا غلام نقشبند سے رجوع کیا، ان رجوع کرنے والوں میں ملا کمال الدین سہالوی بھی تھے (جو اس وقت تک حضرت

سید صاحب کے سلسلۂ ارادت سے وابستہ نہیں ہوئے تھے)۔ ملا کمال الدین اس بنا پر اس کرامت کے منکر تھے، کہ جو معجزہ پیغمبر سے ظہور میں آتا ہے وہ کسی ولی سے کرامت کے طور پر ظہور نہیں پا سکتا، ملا غلام نقشبند اس غلط خیال کی دلائل عقلیہ سے تردید فرما رہے تھے، — یہ مباحثہ شاہ پیر محمد صاحبؒ کے ٹیلے پر ہو رہا تھا۔ جہاں ملا غلام نقشبند، شاہ پیر محمد صاحبؒ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے قیام پذیر رہتے تھے، یہ ٹیلہ دریائے گومتی کے ایک کنارے پر واقع ہے، دریا کے دوسرے کنارے پر تقریباً ٹیلے کے مقابل ایک بزرگ شاہ دوست محمد عرف شاہ دوسیؒ رہتے تھے، شاہ دوسیؒ کے حضرت سید صاحب بانسوی سے گہرے روابط تھے، سید صاحب جب لکھنؤ تشریف لاتے تو شاہ دوسیؒ صاحب کے یہاں قیام فرماتے — ٹیلے پر ملا کمال الدین اور ملا غلام نقشبند میں تکرار و مباحثہ جاری تھا کہ حضرت سید صاحب بانسوی کشف سے معلوم فرما کر شاہ دوسی صاحب کے یہاں سے ٹیلے پر تشریف لائے اور ملا کمال الدین کے مقابل بیٹھ کر فرمایا "تمھیں اس امر میں شبہہ ہے؟ مگر میں اللہ و رسول کی مدد سے یہی چاہتا ہوں اور دیکھو"۔

اس واقعہ سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ملا نظام الدین کے مرید ہونے کا واقعہ ۱۱۲۶ھ سے پہلے کا ہے، کتنا پہلے کا ہے، یہ بتانا پیش نظر مواد تاریخی کی بنیاد پر ممکن نہیں ہے، بہرحال ملا صاحب چالیس سال کی عمر میں نہیں بلکہ ۳۰ سال کی عمر سے پہلے ہی حضرت سید صاحب کے مرید ہو چکے تھے، اور کم از کم گیارہ، سال اپنے پیر طریقت کے وجود ظاہری سے مستفیض ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۱۳۶ھ میں پیر و مرشد نے وصال فرمایا، اس وقت ملا صاحب کی عمر ۴۸ سال کی تھی،

ملا صاحب کے پیر و مرشد حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ نے کم و بیش پچاسی سال میں وصال فرمایا، ان کے ارشاد کا آخری عہد ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال دور کے مطابق تھا، ملک کے نظام سیاسی کی ابتری اپنے ساتھ مسالک و عقائد کی

بے نظمی بھی رکھتی تھی، حصول اقتدار کی ہر چہار جانب سے کشمکش نے اصول و نظریات کو جن سے نظام معاشرت کا قوام تیار ہوتا ہے، اغراض و ہوس نے پس پشت ڈال دیا تھا، پوری سوسائٹی فکر و عمل کی صداقتوں سے محروم ہو کر ظاہر پرستی اور کج فہمی میں مبتلا ہو چکی تھی، تصوف کی بنیادیں بھی کھوکھلی ہوتی معلوم ہو رہی تھیں، اس لیے کہ اس کی روح مردہ ہو گئی تھی، اور نام ہی نام رہ گیا تھا، اعتدال کی جگہ رسمی انتہا پسندی جس کو صاف لفظوں میں ناحق پرستی کہہ سکتے ہیں، رائج ہو گئی تھی، یہ زمانہ تھا جب حضرت سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کو، جو نہ مورد وثی سجادہ نشین تھے نہ اباً عن جد پیرزادے، کج رو اور کج فہم معاشرے کی اصلاح کا فرض سونپا گیا، اور اس طرح سونپا گیا کہ بظاہر حالات اس سمت ان کے متوجہ ہو جانے کی کوئی وجہ نہ تھی، کم عمری میں اپنے نانہالی وطن بانسہ (ضلع بارہ بنکی) سے برائے تعلیم و تعلم ردولی (ضلع بارہ بنکی) بھیجے گئے تھے، راستہ میں ایک درویش سیاح سے ملاقات نے ان کے سفر کی سمت بدل دی، اور پڑھنے پڑھانے سے دست بردار ہو کر اس منزل کی طرف قدم بڑھا دیے جہاں سے انکو وہ فرض انجام دینا تھا، جو ان کو تفویض کیا گیا تھا، ملا نظام الدین مناقب رزاقیہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

در ایام طفولیت و خوردہ سالی از کتابت	بچپن میں حروف و خط (لکھائی پڑھائی)
آشنائی از حروف خط نگرفتہ الا آنکہ	سے شناسائی نہیں حاصل کی، بجز اسکے کہ
دراں ہنگام قرآن مجید را خواندہ	خورد سالی میں قرآن شریف پڑھا تھا،
واز لسان پارسی گرفت، چنانچہ عادت	اور زبان فارسی سے اس طرح شناسائی
ہندست کہ طفلاں را از لسان سفود	پیدا کی تھی جیسا کہ ہند میں رواج تھا،
معتادمی کنند اولاً بالفاظ حروف و	کہ بچوں کو فارسی زبان سے مانوس کراتے ہیں

نقوش خطیہ و بعد از اعتیاد بفہم دلالت نقوش بر الفاظ خود با و طرق دلالت بر معانیش آشنائی کنند و حضرت قدس سرہ الاقدس بمرتبۂ تامہ کہ مقصود از تعوید باشد مانوس نہ شد و یا فی الجملہ شناسائی یافتہ باشد بعد از ان این تعلیم و تعلم از میان رفت قبل از حصول ملکہ بعالم نسیان رفتہ و بالفعل از دلالت نقوش عربیہ و فارسیہ مناسبت یافتہ نہ شد

یوں کہ پہلے حروف کے تلفظ اور نقوش سے واقف کراتے ہیں اور جب سمجھ اس سے مانوس ہو جاتی ہے تو ان نقوش سے جو الفاظ بنتے ہیں ان کو سمجھاتے ہیں پھر ان الفاظ کے مطالب و معانی بتاتے ہیں، حضرت سید صاحب بانسوی اس طرز تعلیم کا جو انتہائی مرتبہ ہے اس سے مانوس نہیں ہوئے یا ہو سکتا ہے کہ فی الجملہ مانوس ہو گئے ہوں، اس کے بعد پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ بیچ سے اٹھ گیا اور ملکہ نوشت و خواند حاصل ہونے سے پہلے ہی جتنی حرف شناسی وغیرہ ہوئی تھی وہ فراموش ہو گئی، اب عملاً عربی اور فارسی تحریر اس کا مطلب سمجھ لینے سے آپ کو کوئی مناسبت نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ عملاً حضرت سید صاحب بانسوی امی (ان پڑھ) تھے، اور جو کچھ کمالات آپ کے حصہ میں آئے اس میں کسب و اکتساب کا کوئی دخل نہیں تھا، کسب و اکتساب علوم ظاہری سے بے نیاز شیخ طریقت حضرت سید صاحب بانسویؒ کا آفتاب ارشاد اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہوتا ہے کہاں؟ اپنے زمانے کے کبار

علوم عقلیہ و دینیہ کے سب سے بڑے مرکز اور اس مرکز کے سب سے بڑے سردار یعنی حکمت و فلسفہ اور منطق و کلام کے امام الوقت کے ذہن و قلب کو اس طرح منور کرنے میں کوئی حکمتِ الٰہی ضرور ہونا چاہیے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اس حکمت الٰہی کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"یہ ظاہر ہے کہ حضرت مجدد صاحب (یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ) کی تعلیم ان نقائص کو جو وحدت الوجود کے مسئلے میں پیدا ہو گئے تھے، دور کرنے کے لیے کافی تھی، اور حضرت شاہ محب اللہ الہ آبادیؒ کے ارشادات نے اس مسئلے کو (وحدت الوجود کے مسئلے کو) کما حقہٗ ظاہر کر دیا، ساتھ اس کے ایک تقابل سا پیدا ہو گیا جس سے ایک جماعت منکرِ وحدت الوجود ہو گئی، اور اس نے منتہائے مقصد اپنا صلاحیت ظاہری قرار دیا، دوسری جماعت اس قدر وحدت الوجود میں مستغرق ہو گئی کہ اس سے آدابِ شریعت ظاہری نظر انداز ہونے لگے۔ سماع و رقص و شاہد پرستی کا اندیشہ غالب ہو گیا، حضرت سید صاحب (بانسویؒ) کے صحبت بر داشتہ علمائے کرام ایسے ہوئے جنہوں نے ان دونوں راہوں کے بین بین طرز اختیار کیا اور خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کیا، ساتھ ہی اس کے کہ علوم ظاہری رکھتے تھے، علم باطن کے بھی ماہر ہوئے اور وحدت الوجود کے قائل ہونے کے باوجود ان کا معیار عرفان اتنا وسیع تھا کہ حالتِ تفرقہ و جمع میں کسی طرح بے امتیاز نہیں ہونے پاتے تھے۔" (فیوض حضرت بانسہؒ)

حضرت سید صاحب بانسویؒ کے فیض صحبت سے ملا نظام الدین نے تصوف کی حقیقت کو کس طرح پا لیا، اس کو اس واقعہ کے ضمن میں معلوم کیا جا سکتا ہے، جو ملا محمد ولی اللہ فرنگی محلی نے بیان کیا ہے:-

در عہد حضرت مولانا نظام الدین سہالوی قدس سرہ شخصے وارد شہر لکھنؤ شد و

ملا نظام الدین کے زمانے میں ایک صاحب لکھنؤ تشریف لائے جو تصوف کی گفتگو

کلام خوش و بیان مطبوع در تصوف
داشت عالمے بادی گرویدہ و خلقے بطرف
وے رجوع آوردہ اوصاف حمیدۂ او
بسمع مولانا رسانیدند و بتواتر حکایات
غریبہ و روایات عجیبہ بطرف او منسوب
کردہ مردم بخدمت مولانا عرض می
ساختند، ہیچ نمی گفت و خاموش ماند
ہرگاہ ہجوم خلائق بر تذکار او از حد گزشت
فرمود: تصوف بلفظ و بیان در نہ آید
آں عبارت از حفظ باطن و اعتماد بر ذات
احدیت است کسے کہ بایں مرتبہ رسد
بقیل و قال نیفتد و طالب حال و
قاصد مآل باشد

بڑی خوش بیانی اور دلنشین انداز سے کرتے
تھے، ایک دنیا ان کی گرویدہ ہوگئی
اور خلقت ان کی طرف متوجہ ہوگئی،
ان صاحب کی خوبیاں بھی لوگ ملا صاحب
سے بیان کرنے لگے، لگاتار حیرت انگیز
واقعات اور نادر حکایتیں ان صاحب سے
منسوب کرکے لوگ ملا صاحب کی خدمت میں
بیان کرنے لگے، مگر ملا صاحب کچھ بولتے ہی نہ تھے،
جب ان صاحب کا حد سے زیادہ تذکرہ
عامۂ خلائق نے ملا صاحب سے کیا تو ملا صاحب
نے بالآخر فرمایا: تصوف وہ فن ہے جو
شرح و بیان کی تاب نہیں لاسکتا، دراصل
ظاہر کے بجائے اپنے باطن کی نگہداشت
اور دوسرے وسائل کے بجائے صرف
ذاتِ خداوندی پر اعتماد کا نام تصوف
ہے، اور جس کو یہ دونوں باتیں حاصل
ہوجائیں پھر وہ قیل قال کے جھمیلے میں
کہاں پڑسکتا ہے، وہ تو اپنے "حال"
کی طلب و جستجو اور انجام کی فکر و
اندیشے میں محو ہوجاتا ہے۔

من بعد مولانا احمد عبدالحق قدس سرہ کہ برادر زادۂ او
و صاحب باطن و اسرار بود امر فرمود: شما رفتہ حال
آں کس دریافتہ بمن اطلاع دہید اگر آں کس از اہل باطن
خواہد بود از آثار باطن او ثمرہ خواہید یافت
آں زماں بملاقات او خواہم رفت
ملا احمد عبدالحق قدس سرہ برائے ملاقات
رفتہ بجز رنگینی عبارت و تزویر و تخلیط
و تغلیط عوام ہیچ نیافتہ بخدمت عم بزرگوار
خود آنچہ مشاہدہ کردہ بود بعرض نمود
مولانا باستماع ایں معنی ارشاد کرد:
صوفی کسے است کہ باطنِ خود را از شرک
پاک سازد و چرک ریا و سمعہ در آں
نگذارد زانکہ باطن خود از حق صاف کند
و بہ باطل کہ سمعہ و ریا است بیالاید
بندگان خدا مدام تطہیرِ باطن خود از
اوصاف ذمیمہ نمایند و ہمیشہ خدمت
شرع شریف مرعی داشتند استقامت
بر ظاہر شرع کار ایشان است و
استقامت بر باطن شرع کہ عبارت

اس کے بعد ملا صاحب نے اپنے بھتیجے اور اسرار
باطنیہ کے واقف ملا احمد عبدالحق قدس سرہ
سے فرمایا: تم جاؤ اور ان صاحب کا حال احوال
دیکھ کر مجھے بتاؤ اگر وہ اصحاب باطن میں ہوئے
اور ان کی باطنی کیفیات کا کوئی اثر تم پر
بھی ہوا تو پھر میں بھی ان سے ملنے جاؤنگا،
ملا احمد عبدالحق نے جاکر دیکھا تو سوائے
رنگین گفتگو، پرفریب خیالات کی گڈمڈ اور
عوام کی غلط رہبری کے وہاں کچھ نہ تھا،
واپس آکر اپنا تاثر عم بزرگوار سے بیان
کردیا، بھتیجے کی بات سنکر ملا صاحب نے فرمایا:
صوفی دراصل وہی ہے جو اپنے باطن کو
آلایش شرک سے پاک رکھے اور دکھاوے
سناوے کے میل کو اندر آنے نہ دے، وہ
صوفی نہیں کہلائیگا جو اپنے باطن کو حق
ہی سے صاف کر ڈالے اور باطل یعنی دکھاوا
سناوا سے اس کو ناپاک کرے، اللہ کے بندے
ہمیشہ اپنے باطن کو اوصافِ ذمیمہ سے
پاک رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور

از تصفیہ قلب و اعتقاد بہ توحید ذات است بر وجہے کہ شرح یافتہ و شانہ ایمان است۔

(عمدۃ الوسائل قلمی)

شرع شریف کی پاسداری اور خدمت کو پیش نظر رکھتے ہیں، ظاہری شرع پر ہمیشہ عمل درآمد کرتے رہنا ان کا عمل ہے اور قلب کی صفائی اور ذات خداوندی پر کلی اعتقاد جس کی کیفیت کی تفصیل بارہا بیان ہو چکی ہے ان کا شعار، اور ان کی پہچان ہے۔

اور یہی تصوف ملا صاحب کو اپنے مرشد کے فیض نظر سے نصیب ہوا اور شریعت کی بھرپور خدمت، باطن پر کڑی نگرانی اور اہل باطن سے انتہائی عقیدت یعنی بظاہر دو متضاد پہلوؤں سے مکمل ہم آہنگی ـــــ ملا صاحب اور ان کے بعد حضرت سید صاحب بانسوی کے سلسلۂ قادریہ رزاقیہ سے وابستہ رہنے والے ان کے رشتہ داروں اور خاندان والوں کا مقصود بنا رہا، ملا نظام الدین، اپنے مرشد کے دربار میں کس مرتبے کے مستحق قرار پائے، اس کی تفصیل ظاہر ہے کہ ملا صاحب کے قلم سے نہ مل سکتی تھی نہ ملتی ہے۔ وہ خود ہر جگہ اپنے کو "بندۂ درگاہ" ہی لکھ کر ذکر کرتے رہے کہ کرامات اور الہامات کے ذکر میں ملا صاحب نے تحریر فرمایا ہے:۔

واز آں جملہ این است کہ بعض یاران چوں از جائے خود با قصد عتبہ بوسی می کردند می فرمود در خانہ کہ خبر می دہ کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات می آیند، خودش می گفت فلاں می آید واین از واقعات بسیار است این

(لسان غیب کی آوازیں سننے کے بکثرت واقعات میں سے) ایک واقعہ یہ ہے کہ بعض مرید، جب اپنے گھر سے آستاں بوسی کے ارادے سے روانہ ہوتے تو حضرت سید صاحب بانسوی اپنے دولت کدے میں فرما دیتے "خبردیت خبردیت (خبر دیتا ہے

حضار مجلس عالی متعارف شدہ بود وقتیکہ می فرمود ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات می آیند می گفتند کہ فلاں فلاں می آید، ہمچوں روز دیا روز دوم می رسد ولیکن این خبر وقتے می رسد کہ مخبر عنہم متجاوز از منزل شدہ مسافر شدہ یا عزم مصمم نمود

(مناقب رزاقیہ)

خبر دیتا ہے خبر دینے والا) کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات آوت ہیں (آ رہے ہیں) یعنی جو ایمان لائے اور جنھوں نے اچھے عمل کیے (آیت کا ترجمہ) خود ہی سے فرماتے کہ فلاں آ رہا ہے اور آپ کی محفل عالی کے حاضرباش اس طرز سے اس حد تک مانوس ہو گئے تھے کہ جب حضرت سید صاحب فرماتے کہ "خبردیت خبردیت کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات آوت ہیں"، تو حاضرباش حضرات فوراً کہنے لگتے کہ فلاں فلاں آ رہے ہیں، اور وہ اسی دن یا دوسرے دن حاضر خدمت ہو جاتے، حضرت سید صاحب کو غیب سے یہ خبر اس وقت ملتی جب وہ جن کے بارے میں خبر دی گئی ہے اپنے گھر سے روانہ ہو کر راستے میں ہوتے یا پھر قصد مصمم کر چکے ہوتے۔

مناقب رزاقیہ کے شارح ملا عبد الاعلیٰ (حفید ملا نظام الدین) نے اپنی شرح محاسن رزاقیہ میں تحریر کیا ہے:۔

از مولوی احمد حسین و مولوی محمد حسن	ملا احمد حسین، ملا حسن، ملا محمد ولی اور
و مولوی محمد ولی و مولوی محمد یعقوب	ملا محمد یعقوب غفر اللہ لہم (شاگردان
غفر اللہ لہم بالاتفاق شنیدہ ام می	ملا نظام الدین اور بھتیجے اور پوتے بھی)
گفتند کہ مراد مولوی نظام الدین	سے بالاتفاق میں نے سنا ہے کہ ان
قدس سرہ و برادر زادۂ وے	الذین آمنوا وعملوا الصالحات سے
مولوی احمد عبد الحق	جن یاران کی آمد کی خبر حضرت سید صاحب
محاسن ذوقیہ (قلمی)	دیتے تھے وہ خود ملا نظام الدین اور
	ان کے برادر زادہ ملا احمد عبد الحق ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ ملا صاحب نے ازراہ کسر نفسی کنایۃً یہاں بات کہی اور اس کے آگے اپنے پیر بھائی حضرت میر اسماعیل بلگرامیؒ کے بارے میں جب اسی طرح کے الہام کا ذکر کیا تو ملا صاحب نے انکے نام کی صراحت کر دی کہ "وقتیکہ میر محمد اسمٰعیل متوجہ ایں صوب می شود خبر می دہد کہ سید عالی نسب می آید" (یعنی جب میر اسمٰعیل بلگرامیؒ اپنے یہاں سے حاضری کے قصد سے روانہ ہوتے تو حضرت سید صاحب فرماتے خبر دیت کہ سید عالی نسب آوت ہیں۔

بہر حال ملا صاحب اپنے مرشد کے دربار میں مقرب بھی تھے اور معزز اور اس درجہ معزز کہ زبان فیض ترجمان سے ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات کا مصداق قرار پائے۔

تفسیر ماجدی اردو

تفسیر ماجدی اردو کا دوسرا اڈیشن جیسا کہ معلوم ہو کثیر التعداد اضافوں کے ساتھ خود مولانا دریابادی کے اہتمام میں ہندوستان میں چھپ رہا ہے، اسکی پہلی جلد آل عمران تک ہے جسکا ہدیہ ۱۸ روپیہ تھا لیکن اب محصول ڈاک کے علاوہ ۱۵ روپیہ کر دیا گیا ہے، تاجران کتب کے لیے مزید رعایت ہوگی۔ شائقین طلب فرما کر اپنا شوق پورا کریں۔ دوسری جلد بھی جو سورۂ نساء سے شروع ہوگی، زیر طبع ہے جو عنقریب شائع ہوگی۔ پتہ: صدق بک ایجنسی کچہری روڈ، لکھنؤ۔

ادبیات

نعت

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

وہی فخر بشر ہے اور وہی محبوب یزداں ہے — ولائے احمد مختار جس کا دین و ایماں ہے

کوئی کہہ دے یہ اس سے غم کے ہاتھوں جو پریشاں ہے — مدینے کی بہاروں میں سکونِ دل کا ساماں ہے

فرشتوں کے جہاں جلتے ہیں پر واں ہو گزر اس کا — بتایا تو نے انسانوں کو کیا معراجِ انساں ہے

ترے محفل نشینوں کا تو ہے کیا ذکر اے مولیٰ — ترے در کا گدا بھی بے نیازِ باغِ رضواں ہے

جو آنسو یاد میں تیری بنا ہے زینتِ مژگاں — متاعِ عیشِ دو عالم اس اک آنسو پہ قرباں ہے

ہے اہلِ دل کا شیوہ نام پہ تیرے فدا ہونا — تری مرضی پہ جاں دینا شعارِ اہلِ ایماں ہے

تری تعلیم نے انساں کو نورِ معرفت بخشا — ترا قرآن دنیا میں چراغِ راہِ عرفاں ہے

جوابِ مہر ہے تابندگی میں ہر خزف ریزہ — ہر اک ذرہ ترے کوچے کا رشکِ ماہِ تاباں ہے

سفینے کو مرے جب مل گیا ہے نا خدا تجھ سا — مجھے کیا غم ہے گر ہستی ہلاکت خیز طوفاں ہے

اٹھا نظریں سوئے کعبہ اگر طالب ہو رحمت کا — مدینہ کی طرف رخ کر اگر جنت کا خواہاں ہے

میں عاصی ہوں مگر کیا خوف مجھ کو نارِ دوزخ سے — شفیعِ روزِ محشر کا مرے ہاتھوں میں داماں ہے

ضرورت آج بھی دنیا کو ہے تعلیم کی اس کی — جو اخلاقِ مجسم ہے ز سر تا پا جو احساں ہے

خرد کو جب بھی ہوا ہے تامل اسکی ہستی میں
زباں سے دل یہی کہتا ہو کہ مدے جھجک "ہاں ہے"

تری رحمت کی بارش سے گلِ امید ہے تازہ
ترا دامانِ بخشایش پناہِ اہلِ عصیاں ہے

غزل

از جناب وفا براہی

یہ سمجھ آئی کہاں سے ترے دیوانے میں
شمعِ امید جلا رکھی ہے ویرانے میں

نغمۂ و نور کی بارش جو ہو میخانے میں
فکرِ فردا کو کروں قید میں پیمانے میں

مجھکو معلوم ہے انجامِ محبت لیکن
لفظ "ناکام" نہیں ہو مرے افسانے میں

نکہتِ بادِ بہاری کے پرکھنے والو
مقصدِ گل ہے نہاں پھول کے مرجھانے میں

بزمِ افکار کو رنگین بنانے والے
بے کسی ڈھونڈ رہی ہو تجھے ویرانے میں

سوزشِ دل نے کیا اور جو بیتاب اسے
شمع کا عکس جھلکنے لگا پروانے میں

میں نے مانا کہ ہے جینا بھی مصیبت لیکن
خوفِ رسوائی ہمت بھی ہو مرجانے میں

عالمِ یاس کی تصویر دکھا کر آخر
حسن مشغول ہوا عشق کو سمجھانے میں

سینۂ شمع کو سے چاک یہ ہمت کب ہے
سوزِ الفت کی کمی ہے ابھی پروانے میں

اپنے ناپختہ سوانح کی لطافت لے کر
رنگ بھرنے کو وفا جاتے ہو افسانے میں

نوائے عصر - جناب یحییٰ اعظمی کا دوسرا تازہ مجموعۂ کلام ۔ قیمت تین روپئے ۔

مطبوعات جدیدہ

نقوشِ اقبال - از مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں
اردو تقطیع اوسط ضخامت ۲۳۲ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ
پتہ :- مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ۔

اسلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ دین وملت کی خدمت کسی قوم وقبیلے کے ساتھ مخصوص نہیں، اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس کے حصہ میں آجائے ۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

اس دور میں اس کی مثال علامہ اقبال تھے، وہ ایک نومسلم برہمن خاندان میں پیدا ہوئے اور ان کی تعلیم تمامتر جدید ہوئی، مگر اسی آذر کدے سے اس دور کا یہ ابراہیم پیدا ہوا، وہ خود کہتے ہیں :

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی
برہمن زادۂ دانائے رمزِ روم وتبریز است

اللہ تعالیٰ نے اُن سے دین وملت کا وہ کام لیا جو اس دور کے بڑے بڑے خاندانی علماء سے نہ ہو سکا، وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے مسلمان حکیم وفلسفی اور اسلامی روح کے ایک نامور عارف تھے، مغربی تہذیب، مغربی علوم اور اس کے فلسفوں پر ان کی نظر بڑی گہری اور ناقدانہ تھی، وہ ان کی ایک ایک کمزوری سے واقف تھے، اس لیے وہی اس کام کو انجام دے سکتے تھے، انھوں نے اس دور کے مسلمان مصلحین کی طرح مغربی علوم اور مغربی تہذیب

کے سامنے سپر نہیں ڈالی اور اسلام کو ان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسکو اس کی اصلی شکل میں پیش کرکے اس کی روح کو زندہ کیا، اور مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو بے نقاب کرکے دکھایا کہ یہ تہذیب خود لب گور ہے، وہ دوسروں کو کیا زندہ کرسکتی ہے اور اس مادی دور میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی قوموں کی فلاح اسلام کے دامن سے وابستہ ہے، وہی انسانیت کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے، اور اس کی تعلیمات کو ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ کوئی عقل سلیم اس سے انکار نہیں کرسکتی، اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی و ملی روح کو بیدار کرنے میں ان کا سب سے بڑا حصہ ہے، ان کی شاعری حساس مسلمانوں میں وجد طاری کردیتی ہے، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے لیکر علماء و مشائخ تک اس پر سر دھنتے ہیں،

ان کے کلام اور پیام پر بہتوں نے لکھا ہے، اور اپنے ذوق و نظر کے مطابق اس کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، ان میں جن کو اقبال سے جس قدر فکری ہم آہنگی ہے، اسی قدر انھوں نے ان کی بہتر ترجمانی کی ہے، ان میں ایک مولانا ابو الحسن علی ندوی بھی ہیں، ان دونوں کا نصب العین اور ان کے خیالات کا سرچشمہ ایک ہے، دونوں اسلام کے داعی و مبلغ ہیں، دونوں کا مقصد ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح اور اس کو مغربی تہذیب کے سحر سے بچانا ہے، فرق یہ ہے کہ مولانا ابو الحسن علی کی زبان یقینًا مذہبی ہے اور علامہ اقبال کی حکیمانہ اور شاعرانہ، لیکن دونوں کے دل کی آواز ایک ہے، اس لیے مولانا کو ان کے کلام پر لکھنے کا سب سے زیادہ حق تھا اور انھوں نے اس کتاب میں اس کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

انھوں نے عرب دنیا کو اقبال کے کلام و پیام سے متعارف کرانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر عربی میں مضامین لکھے تھے، ان کا مجموعہ عرصہ ہوا "روائع اقبال" کے نام سے شائع

ہوچکا ہے، نقوش اقبال مصنف کے ترمیم و اضافوں کے ساتھ اسی کا اردو ترجمہ ہے، اقبال کے کلام میں خیالات کا ایک عالم ہے، چند مضامین میں ان کا احاطہ دشوار بھی ہے اور مصنف کا مقصد بھی نہیں تھا، اسلیے انھوں نے انکی اہم نظموں اور متفرق اشعار سے اسلام کی بنیادی تعلیمات، ان کی روح اور ملت اسلامیہ کی تجدید و اصلاح، مغربی تہذیب اور اس کے علوم وغیرہ کے متعلق اقبال کے افکار و خیالات کا خلاصہ اور لب لباب پیش کردیا ہے، جس سے اس کے اہم رخ سامنے آجاتے ہیں، اقبال کا نصب العین، ان کے خیالات کی رفعت و گہرائی، ان کی حکیمانہ تعبیریں، ان کے بیان کی سحر آفرینی بجائے خود اعجاز کی حیثیت رکھتے ہیں، فاضل مصنف کی موثر و دلنشین تشریح و تبصرہ نے اس سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے، "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا"۔ اگرچہ یہ کتاب مختصر ہے لیکن اقبال کے مقصد پیام اور افکار و تصورات کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے، عربی میں مصنف کا حسن انشاء مسلم ہے۔ لائق مترجم نے اس کی ساری خوبیوں کو ترجمہ میں منتقل کردیا ہے، اور ترجمہ اتنا سلیس ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، یہ کتاب صاحب ذوق مسلمانوں خصوصًا اقبال کے کلام سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔ "م"

انڈو ایرانیکا سلور جوبلی نمبر (انگریزی)۔ یہ انگریزی سہ ماہی رسالہ ایران سوسائٹی، کلکتہ کا ترجمان ہے، ابتک اسکی ۲۳ جلدیں اعلیٰ چھپائی کے ساتھ نکل چکی ہیں، اسکے بانی مدیر ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم تھے، جنھوں نے پچیس سال پہلے ایران سوسائٹی قائم کرکے اس رسالہ کے ذریعہ سے فارسی علم و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اللہ کے پیارے ہوئے، انکی زندگی ہی میں اس رسالہ کے نکالنے کا بار خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ کلکتہ ہائی کورٹ نے اپنے ذمہ لے لیا تھا، انکی نگرانی میں یہ رسالہ اپنے پورے معیار کیساتھ نکل رہا ہے، ۱۸ مارچ ۱۹۷۰ء کو ایران سوسائٹی کی سلور جوبلی منائی گئی، زیر نظر رسالہ میں اس جوبلی کی شاندار تقریب کی پوری روداد ہے، جسکو پڑھتے وقت ناظرین کو ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خود اس میں شرکت کررہے ہیں، اس ایران سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر محمد اسحٰق کی تصویر کے ساتھ جشن کی مختلف تقریبوں کی تصویریں بھی ہیں، ایران کے سفیر ہز اکسلنسی امیر تیمور

مغربی بنگال کے گورنر ایس۔ ایس دھاون اور کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس پی۔ بی۔ مکرجی نے اس میں خاص طور پر شرکت کی، انکی تقریریں بھی ہیں، جن سے ایران سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، اسکے سرگرم سکریٹری ایم۔ اے مجید کی رپورٹ سے اسکے مختلف کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، اس جشن میں فارسی اور اردو میں جو نظمیں پڑھی گئیں وہ بھی اس میں ہیں، پھر علمی حیثیت سے وہ مقالات بڑے مفید ہیں جو اس موقع پر پیش کیے گئے، ان میں کچھ یہ ہیں: فارسی حروف تہجی، از ڈاکٹر محمد اسحٰق۔ ہندی الایرانی عہد، از پروفیسر فیروز دستی دادر شوریدہ شیرازی، از ایم۔ اے مجید۔ ہند و ایران کے تعلقات، از ڈاکٹر چین ادئی دت۔ سبک ایرانی کے علمبرداروں کو ہندوستانی اہل علم کے تحفے، از سید صباح الدین عبدالرحمن، اردو کا عظیم شاعر، غالب، از پروفیسر مسعود حسن۔ ڈاکٹر محمد اسحٰق۔ تاثرات، از خواجہ محمد یوسف۔ پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر حیدر نیر۔ پہلوی خاندان کے زمانہ میں تعلیم از مہدی کاشیخانی۔ گریش چندر سین۔ بنگال میں فارسی اور عربی کا ایک فاضل از ڈاکٹر عطا کریم۔ زبان فارسی در ایالت تامل نادو، از حیدر علی خان جنگ گی۔ روابط ہند و ایران در عصر حاضر، از ڈاکٹر حکیم الدین قریشی۔ مرزا غالب دہلوی از ڈاکٹر مختصر عباسی۔ مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بڑے سلیقہ اور معیار کے ساتھ نکالا گیا ہے، اسکے مدیر انتظامی خواجہ محمد یوسف خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ص"

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	عطاء اللہ
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین
اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	

میں عطاء اللہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عطاء اللہ

جلد ۱۰۷۔ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۱ء۔ عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ